کرشن چندر

فلمی قاعدہ

U-21





فلمی قاعدہ! فلمی دنیا کے عجیب و غریب ماحول کی نہایت
دلچسپ واقفیت بہم پہنچانے والی ایک انوکھی کتاب! جس
میں آپ کے جانے پہچانے ادیب کرشن چندر نے ا، ب
وغیرہ کی ترتیب سے فلمی دنیا کے ہر ہر پہلو کو اپنے قلم کی تیز نوک
پر اُتارا ہے۔

فلمی دنیا کی ا — 'انہونی' سے لے کر ق — 'قینچی' اور
ر — 'رومانس' وغیرہ تک کی رنگینیاں، طنز اور مزاح کی آمیزش
پاکر اس قدر جاندار ہو گئی ہیں کہ پڑھتے ہی بنتا ہے ......

ہند

پاکٹ

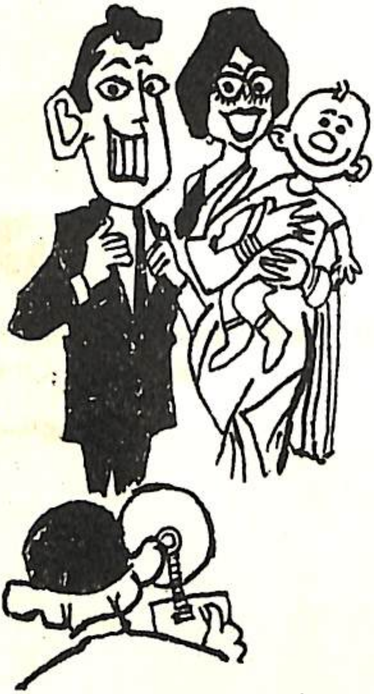
بکس

پرائیویٹ لمیٹڈ
جی۔ٹی روڈ
شاہدرہ، دلی ۳۲

(یونین پریس، دلی)

فلمی قاعدہ

کرشن چندر



FILMI QUAIDA : HUMOUR AND SATIRE

KRISHAN CHANDER

قیمت ایک روپیہ

فلمی قاعدہ

عجب زمانہ آن لگا ہے ۔ آجکل بچے پیدا ہو کر ڈیڈی بعد میں کہتے ہیں۔ دلیپ کمار
نا پہلے سیکھ جاتے ہیں۔ ماں کا لفظ زبان پر بعد میں آتا ہے۔ مینا کماری سب سے پہلے
جاتا ہے اور بہت آسانی سے! جو حال گھر کا ہے۔ وہی اسکول کا ہے۔ ایک دفعہ
ے اسکول میں پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے پوچھا۔ "بچو۔ بتاؤ رامائن کس نے
ی ؟" جواب ملا۔ "بابو بھائی مستری نے!" ــــــ میں نے پوچھا۔ "مشہور مغل
شاہوں کے نام گناؤ؟" ــــــ بولے "مغلِ اعظم۔ بابر۔ شاہجہان۔ پکار اور کے۔
صف!" میں نے پوچھا۔ "بمبئی کا جغرافیہ بیان کرو"۔ بولے۔ "بمبئی کے مشرق
ں چیمبور ہے جہاں راجکپور رہتا ہے۔ شمال میں پالی ہل ہے جہاں دلیپ رہتا ہے
رب میں ویجنتی بالا کا مکان ہے اور جنوب میں جے نتری کا!" ــــــ میں نے
ی دن اسکول سے استعفیٰ دے دیا اور گھر چلا آیا۔

گھر آکر بہت سوچا۔ بہت سوچا۔ آخر سمجھ میں آیا کہ غلطی میری ہے۔ دراصل

یہ فلم کا عہد ہے۔ہندوستان میں صرف پندرہ فی صدی لوگ پڑھے لکھے ہیں۔
لیکن سینما دیکھنے والے سو فی صدی ہیں۔ اس لئے اگر لوگوں کو پڑھے لکھے بنانا ہے
تو اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ انہیں فلم کے ذریعے سے تعلیم دی جائے
یہی سوچ کر میں نے مندرجہ ذیل فلمی قاعدہ لکھا ہے۔میرا دعویٰ ہے کہ اس کے پڑھنے
سے ہر وہ شخص جو پڑھا لکھا نہیں ہے بہت جلد پڑھنا لکھنا سیکھ سکتا ہے۔ اپنے
دیش اور اپنے ماں باپ کا نام روشن کر سکتا ہے —— اس
قاعدے کی فلم بھی بن سکتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک حرف کی فلم بن سکتی ہے۔
جو پروڈیوسر چاہے مصنف کی اجازت حاصل کئے بغیر اس کی فلم بنا سکتا ہے۔
اور اس کے اندر ناچ اور گانے اپنی حیثیت اور حماقت کے مطابق ڈال سکتا ہے!

لیجئے اب شروع کرتا ہوں

بچو!

الفؔ سے اندھیرا ہوتا ہے جو فلم انڈسٹری کے لئے بے حد ضروری ہوتا ہے۔دُنیا
کا ہر کام دن کی روشنی میں ہوتا ہے۔اسکول دن میں کھلتے ہیں۔کارخانے دن میں چلتے
ہیں۔دفتر دن میں کھلتے ہیں۔لیکن فلم کا ہر کام اندھیرے میں ہوتا ہے۔فلم اندھیرے
میں بنائی جاتی ہے۔اندھیرے میں دھوئی جاتی ہے اور اندھیرے میں دکھائی جاتی
ہے۔اس انڈسٹری میں شروع سے آخر تک اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔اس لئے اس
انڈسٹری میں کامیاب ہونے کے لئے عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہونا بے حد
ضروری ہے!

تو پیارے بچو! جلدی سے اپنی آنکھیں بند کرو اور زور سے کہو ——

"الف سے اندھیرا"

الف سے آئینہ ہوتا ہے۔جو ہر فلم کی جان ہوتا ہے۔فلم کیمرے میں چلتی

ہے جو ایک طرح کا آئینہ ہوتا ہے ۔ ہیروئین آئینے میں اپنی صورت دیکھتی ہے اور میک اپ کے ذریعے اپنی بدصورتی چھپانے کی کوشش کرتی ہے ۔ پروجیکٹر بھی ایک طرح کا آئینہ ہی ہوتا ہے جس میں سے روشنی گزار کر فلم پردے پر پھینکی جاتی ہے ۔ پروڈیوسر دراصل ایک طرح کا آئینہ ساز ہوتا ہے جو لاکھوں روپے خرچ کرکے آپ کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اگر کامیاب ہوگیا تو لاکھوں کے وارے نیارے کرلیتا ہے ورنہ سر جھکا کر کہتا ہے ——————

"آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے !"



اس لئے بچو، تنگ موہری کی پتلون پہنو ۔ لال رنگ کی بش شرٹ، بالوں کو ماتھے پر گرالو اور آئینہ کو دیکھ کر کہو —————— "الف سے آئینہ"

"الف سے انٹرویو"

الف سے انٹرویو بھی ہوتا ہے جو ہر فلم کمپنی میں ہوتا ہے۔ انٹرویو کئے بغیر فلم انڈسٹری میں کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ انٹرویو دوسری جگہوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ دوسری جگہوں پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کی عقل کیسی ہے؟ یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کی شکل کیسی ہے؟ دوسری جگہوں پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ



نے کالج کے کتنے امتحان پاس کئے ہیں۔ یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آپ کتنے امتحانوں میں فیل ہوئے ہیں ——— اور جو آدمی جتنا زیادہ فیل ہو چکا ہوگا اتنا ہی فلم انڈسٹری میں زیادہ کامیاب ہوگا۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لڑکا اسکول یا کالج میں فیل ہوتا ہے فوراً گھر سے بھاگ کر کسی فلم کمپنی میں انٹرویو کرنے کے لئے بمبئی کا رُخ کرتا ہے۔ اس لئے بچو تم بھی جلدی سے اپنی کتابیں پھاڑ دو۔ سامان باندھو۔

اور بولو ———

"الف سے انٹرویو ——— !"

الف سے ایچکدانہ ہوتا ہے جو ہمیشہ بیچکدانے کے ساتھ لگا رہتا ہے جیسے شنکر کے ساتھ جے کشن ——! تم نے مہاتما گاندھی کا نام نہیں سنا ہوگا۔ لیکن وہ مشہور گیت ضرور سنا ہوگا۔ "ایچکدانہ، بیچکدانہ دانے اُوپر دانہ!" یہ ایک مشہور فلمی گیت ہے جسے بعض ہونہار بچے بندے ماترم کی جگہ گاتے ہیں اور اسکول کی سالانہ نمائش میں انعام پاتے ہیں —— اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ کوئی بچہ مجھے آج تک نہیں سمجھا سکا۔ لیکن اس میں بچّوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ دراصل یہ دُنیا اتنی ترقی کر گئی ہے اور اس دنیا کے ساتھ ساتھ علم اور سائنس اتنی ترقی کر چکے ہیں کہ ہر بات کا جاننا بہت مشکل ہے۔ آپ کسی بچے سے پوچھئے کہ اس نے کلاس میں کتنے نمبر حاصل کئے؟ بڑی مشکل سے بتائے گا۔ لیکن دلیپ کمار کی کار کا نمبر پوچھئے۔ فوراً بتا دے گا —— اس لئے بچو اگر فلم میں کام کرنا چاہتے ہو تو کسی بات کا مطلب جاننے کی کوشش مت کرو۔ جلدی سے سر ہلا کر کہو ——

"الف سے ایچکدانہ!"

الف سے ایمانداری بھی ہوتی ہے جو آجکل کی دُنیا میں صرف بلیک کے بھاؤ ملتی ہے اسی لئے میں نے ایمانداری کا نام نہیں لیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ایمانداری کوئی ہیرو تو ہے نہیں۔ وہ کوئی ہیروئن بھی نہیں ہے جسے فلم کے پردے پر دکھایا جاسکے۔ اور آجکل کے بچوں کا یہ دستور ہے کہ جس چیز کو وہ فلم پر نہیں دیکھ سکتے۔ اسے سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ آجکل کے زمانے میں ایمانداری ایک بے مطلب بے معنی سمجھ میں نہ آنے والی شے ہے۔ یعنی جو ایمانداری ہے وہ گویا ایک طرح کا ایچکدانہ ہی ہے۔ اس لئے بچو ایمانداری کو بھول جاؤ اور زور سے کہو۔

"الف سے ایچکدانہ ——!"

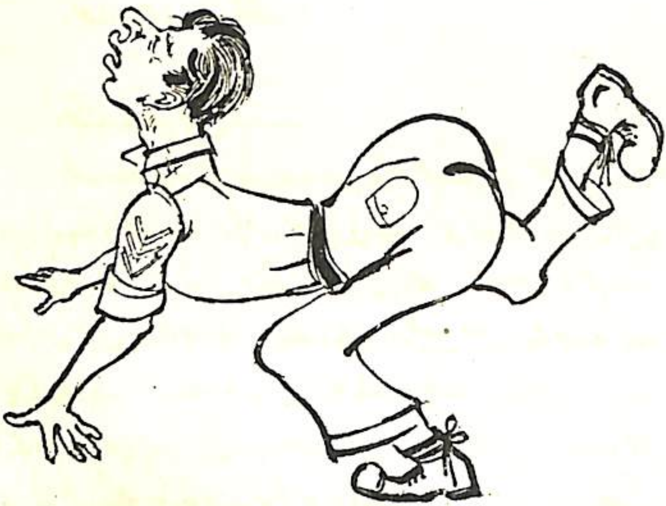
الف سے اُدھار ہوتا ہے۔ جس پر اکثر فلم کمپنیوں کا دار و مدار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک فلم کمپنی صرف تین چیزوں کے سہارے چلتی ہے۔ سنگھار۔ اشتہار اور اُدھار —— ! ان میں سب سے زیادہ ضروری چیز اُدھار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُدھار محبت کی قینچی ہے مگر وہ فلم کمپنی کی جان ہے۔ اگر کہیں سے اُدھار نہ ملے تو دو تہائی فلم کمپنیوں کی جان نکل جائے۔ اگر شوٹنگ کے وقت کپڑے والا کپڑے ادھار نہ دے تو اکثر ایکسٹرا لوگ سیٹ پر چاڈھی پہنے گھومتے نظر آئیں۔ اگر کنٹین کھانا ادھار نہ دے تو سارا اسٹاف بھوکا مر جائے۔ اگر اسٹوڈیو والا اسٹوڈیو اُدھار نہ دے تو اسی وقت پیک اَپ ہو جائے —— یہاں کہانی ادھار پر آتی ہے۔ ہیروئن ادھار پر آتی ہے۔ سیٹ اُدھار پر بنایا جاتا ہے۔ فرنیچر اُدھار پر سجایا جاتا ہے۔ ہیئر ڈریسر اُدھار پر ملتی ہے۔ کیمرے کی ہر ریل ادھار پر چلتی ہے۔ ہیرو کا گھوڑا۔ ولین کا کوڑا۔ ارجن کا رتھ۔ سونے کا مٹھ۔ گالوں کی لالی۔ کانوں کی بالی۔ دلہن کا صندوق۔ سپاہی کی بندوق۔ مرغی کا انڈا۔ جادو کا ڈنڈا۔ سب کچھ اُدھار پر ملتا ہے۔ گویا فلم کمپنی کی جو بہار ہے خالص اُدھار ہے! آپ نے وہ محاورہ تو ضرور سنا ہوگا۔ ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ یہ ضرور کسی فلم کمپنی میں کام کرنے والوں کی صورتوں کو دیکھ کر بنایا گیا ہے۔ اس لئے بچو اگر فلم پروڈیوسر بننا چاہتے ہو تو ابھی سے ادھار مانگنا شروع کر دو۔ اور بولو ——

"الف سے ادھار !"

الف سے اُوٹ پٹانگ !

عام طور پر اُوٹ پٹانگ کسی ایسی بات کو کہتے ہیں جس کا کوئی سر پیر نہ ہو۔ جو بالکل بے معنی۔ بے کار اور مہمل ہو —— مگر فلم انڈسٹری میں اس کا مطلب ہے

کہانی !—— باقی ہر بات کا فلمی دنیا میں کوئی نہ کوئی مطلب ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اصول ہوتا ہے۔ اس کے استعمال کرنے کا کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کیمرے کا فلٹر استعمال کرنے کا ایک اصول ہے۔ گھوڑے کو دوڑانے کا ایک طریقہ ہے کیمرے کے ساتھ مائیک کو استعمال کرنے کا ایک مطلب ہے —— لیکن فلمی کہانی کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے نہ طریقہ ہوتا ہے - اور اکثر حالتوں میں اس کا مطلب بھی نہیں ہوتا۔



لیکن اس میں قصور نہ کہانی لکھنے والے کا ہے نہ کہانی فلمانے والوں کا۔ بلکہ دیکھنے والوں کا جن کو صرف اوٹ پٹانگ کہانیاں پسند آتی ہیں - یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو کہانی جتنی زیادہ اوٹ پٹانگ ہوگی اتنی ہی زیادہ لوگوں میں مقبول ہوگی۔ اگر ہیرو قاعدے اور شرافت سے محبت کرے تو کس کو پسند آتی ہے۔ لیکن اگر وہ ہیروئن کو کمر سے پکڑ کر دو چکریاں دے کر اپنے سر پر اٹھا کر باہر گلی میں نکل

آتے اور سڑکوں پر گیت گانا چلے تو واہ واہ کے ڈونگرے برس جاتے ہیں اور لوگ سینما کے باہر کیو پر کیو لگانے لگتے ہیں۔ مجھے خود ایسی اوٹ پٹانگ کہانیاں بہت پسند آتی ہیں۔ جن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ لیکن جو بڑے مزے میں ہنساتی اور رُلاتی جاتی ہیں۔ کیونکہ اندر سے میں بھی ایک بچہ ہوں۔ چھوٹا سا۔ تمہاری طرح۔ اس طرح آؤ بچو! اوٹ پٹانگ تصویریں دیکھیں اور کہیں ——

الف سے اوٹ پٹانگ !

الف سے اَن ہونی ——

الف سے اَن ہونی ہوتی ہے۔ اَن ہونی کا فلم سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اَن ہونی وہ ہوتی ہے جو فلم کے سوا اور کہیں نہیں ہوتی ہے۔ ایسی کہانی جو زندگی میں کہیں نہ دکھائی دے۔ ایسے ڈریس جو لوگ کبھی نہیں پہنتے۔ ایسے مکان جو فلم کے سوا اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ ایسے ناچ جو اور کہیں نہیں ناچے جاتے۔ ایسے سپاہی جو ایک تلوار سے ساری فوج کو کاٹ کے پھینک دیتے ہیں — یہ اور ایسی دوسری اَن ہونی باتیں آپ صرف فلم میں دیکھ سکتے ہیں اور لوگ دراصل اسی لئے فلم دیکھنے جاتے ہیں۔ کیونکہ جو ہونی ہے یا ہو سکتی ہے اسے دیکھنے کی کسے چاہ ہے؟ اسی لئے ہر اچھی فلم ان ہونی سے شروع ہوتی ہے اور اَن ہونی پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اَن ہونی وہ سندر سپنا ہے جو ہر شخص اپنے دل میں چھپائے گھومتا ہے اور جسے وہ صرف فلم کے پردے پر دیکھ سکتا ہے۔ اور بچوں سے زیادہ سندر سپنے کون دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے اَن ہونی کو یاد رکھو اور کہو —— الف سے اَن ہونی ——!

الف سے ایکسٹرا

الف سے ایکسٹرا ہوتا ہے اور ہوتی بھی ہے۔ یعنی ایکسٹرا مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی۔ فلم میں جب کسی گلی محلّے یا بازار کا سین دکھایا جاتا ہے تو اس میں چلنے پھرنے والے لوگوں کی اکثریت ایکسٹرا ہوتی ہے ——— !
وہ پان بیچنے والا ایکسٹرا ہے اور وہ جو دوکان پر کھڑا ہو کر "ایک پونا کالا کانڈی" پان کی فرمائش کر رہا ہے۔ وہ بھی ایکسٹرا ہے۔ بادشاہ کے درباری ایکسٹرا ہوتے ہیں۔ وہ دربان جو لال رنگ کا چوغا پہنے سنہرے رنگ کی موٹھ والی چھتری ہات میں لئے بادشاہ کے آگے چل رہا ہے اور بلند بانگ لہجے میں چلّا رہا ہے "باادب با ملاحظہ ہوشیار" وہ بھی ایکسٹرا ہے۔ کبھی کبھی بادشاہ بھی ایکسٹرا ہوتے ہیں جیسے کہ آجکل اکثر ملکوں میں ہوتے ہیں۔ یعنی سنہری وردی پہنے تخت پر بیٹھے ہیں مگر مجال نہیں کہ اپنی مرضی سے اپنے جوتے کا تسمہ بھی کھول سکیں!

مجھے آجکل کے بادشاہوں اور فلم کے ایکسٹرا لوگوں کو دیکھ کر بڑی ہمدردی ہوتی ہے۔ مگر دراصل یہ لوگ کسی ہمدردی کے محتاج نہیں ہیں ——— !
فلم کے ایکسٹرا فلمی دُنیا میں سب سے کم کماتے ہیں۔ مہینے میں کسی کو پانچ دن تو کسی کو دس دن کام ملتا ہے۔ باقی دن یہ مانگے تانگے سے کس طرح چلاتے ہیں؟ بھگوان ہی بہتر جانتا ہے مگر اس پر بھی یہ فلمی دنیا سے الگ نہیں ہو سکتے۔ کسی قیمت پر الگ نہیں ہو سکتے۔ اگر یقین نہ آئے تو کسی فلمی ایکسٹرا کو جو مہینے میں بڑی مشکل سے پچیس روپے کماتا ہے ——— پچاس روپے کی دربانی پیش کرکے دیکھیے۔ وہ ٹھوکر مار دے گا۔ کام کو بھی اور آپ کو بھی۔ اسے فلمی

دُنیا میں پانچ دن کام کر کے باقی پچیس دن بھوکا مرنا منظور ہے۔ مگر وہ کوئی اور کام نہیں کر سکتے ـــــ!

دراصل یہ ایکسٹرا وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہیرو یا ہیروئین بننے کی خواہش میں ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھر چھوڑ کر اپنے ماں باپ۔ بھائی بہن۔ خاوند بیوی۔ بچے سب چھوڑ کر بمبئی چلے آتے ہیں اور بھیڑوں کی طرح ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ پر دھکیلے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر مرد یا عورت کی آنکھوں میں ایک خواب بستا ہے۔ کبھی وہ ہیرو یا ہیروئن بن جائیں گے اور بدقسمتی سے فلمی دُنیا میں چند ایسی مثالیں موجود ہیں کہ کبھی ایک ایکسٹرا دو سال تک ایکسٹرا رہا۔ پھر اچانک ہیرو ہو گیا۔ ایک لڑکی جو پانچ سال تک ایکسٹرا رہی اچانک ہیروئن بن گئی اور امپالہ میں بیٹھ گئی۔ اسی لئے یہ خواب کسی ایکسٹرا کی آنکھوں سے نہیں ہٹایا جا سکتا ـــــ!

میں اپنے ایک فلمی ایکسٹرا دوست کو جانتا ہوں۔ آج سے دس سال پہلے وہ اپنی دو سو کی ملازمت چھوڑ کر بمبئی میں ہیرو بننے کے لئے آیا تھا۔ اس کی شکل تو اُود بلاؤ جیسی ہے۔ مگر بال دلیپ کمار جیسے رکھتا ہے اور اس لئے اپنے آپ کو کسی طرح دلیپ کمار سے کم نہیں سمجھتا۔ فلمی دنیا میں آتے ہی اسے جو پہلا کام ملا۔ وہ لاٹھی اٹھا کر ایک ٹھاکر کے پیچھے چلنے کا تھا۔ دس سال بعد آج بھی وہ اسی طرح لاٹھی اٹھا کر اسٹوڈیو کے دروازے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ مگر فلمی دنیا سے باہر نہیں جائے گا ـــــ!

فلم کا ایکسٹرا آج کی دنیا کا ڈان کوئکسوٹ (DON QUIXOTE)

ہے - وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے اور اپنی چاہت کا نیزہ ہات میں لیئے کسی چمکتی ہوئی ہوا چکی کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ اسے اس کے خوابوں میں گرفتار رہنے دو۔ اور سبق سیکھو کہ: ———

الف سے ایکسٹرا ———!

الف سے ایکٹر

ایکٹر بمبئی میں دساور سے آتا ہے۔ پنجاب سے آتا ہے، اور یو پی سے آتا ہے اور جب سے فلم انڈسٹری میں ہر صورت اداکاروں کی مانگ بڑھ گئی ہے تو حیدر آباد سے بھی آتا ہے۔ ایکٹر کا سینہ چوڑا، ٹانگیں پتلی، آنکھیں گھٹی ہوئی اور بھویں منڈی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کی جیب میں چنے اور منہ میں عبداللہ سگریٹ ہوتا ہے۔ اکثر دادر مین روڈ پر ٹہلتا نظر آتا ہے۔

ایکٹر دو قسم کا ہوتا ہے۔ چھوٹا ایکٹر اور بڑا ایکٹر ——— چھوٹے ایکٹر کا حال تو اوپر بیان ہو چکا ہے۔ بڑے ایکٹر کا حال بتاتے ہوئے ذرا ڈر لگتا ہے۔

ایکٹر، ایکسٹرا سے اونچی ذات کا ہوتا ہے۔ اسے ہر وقت کلا کا کیڑا کاٹتا رہتا ہے۔ آرٹ اور فن کے میدان میں وہ ایکسٹرا تو کجا کسی ہیرو یا ہیروئن کو خاطر میں نہیں لاتا ——— اس کا خیال ہے کہ فلمی دنیا کا سارا بھرم اس کے دم سے قائم ہے اور یہ بات کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ایکٹر اپنے فن کا پجاری ہے۔ اور فلم اپنے کمرشل دھندوں کے باوجود ایک فن ہے جس کا پجاری ایکٹر ہے۔ مگر ایکٹر بننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ایک ڈاکٹر بننا۔ انجنیئر بننا۔ اس میں علم اور



تجربے کے ساتھ ساتھ خون پسینہ ایک کر دینا پڑتا ہے۔ اس کام کے لئے دل اور روح کا انہماک چاہیئے اور برسوں کی ریاضت - ہماری فلم انڈسٹری بھی اچھے ایکٹروں سے خالی نہیں ہے بلکہ بعض تو ان میں سے اتنے اچھے اور اپنے کام کے اتنے ماہر ہیں کہ دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے فلم ایکٹر کے مقابلے پر رکھے جا سکتے ہیں۔

مگر اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ دل میں کام کی لگن ہو اور پیسے کا زیادہ لالچ نہ ہو۔ ست رنگی بُش شرٹ پہننے سے اچھا ایکٹر نہیں بنتا بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایکٹر جذبات و احساسات کی ست رنگی دُنیا پر قادر ہو ——!

اس لئے کہو۔۔ الف سے ایکٹر!

الف سے ایکٹریس

کالی، پیلی، نیلی، گوری، اودی، عنابی —— ایکٹریس ہر رنگ کی ہوتی ہے اور سحر ہونے تک ہر رنگ میں جھلتی رہتی ہے۔ ایکٹریس بھی دساور سے آتی ہے اور اکثر حالتوں میں کسی کے ساتھ بھاگ کر آتی ہے اور بمبئی آکر کسی ہوٹل میں قیام کرتی ہے اور اپنے زیور فروخت کرکے گذر کرتی ہے۔ اس کے بعد وہ فلم کمپنی میں اپنا جسم بیچنے جاتی ہے۔ فلم کمپنی میں خوبصورت جسم کو آرٹ کہتے ہیں اور پرو ڈیوسر سے لے کر سیٹ کے چپراسی تک آرٹ کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ ایکٹر کے مقابلے میں ایکٹریس بہت جلد ترقی کر لیتی ہے اور جتنی زیادہ خوبصورت ہوگی اتنی ہی جلدی ترقی کرلیگی۔ بعض ایکٹرسوں کو ہیروئن بننے میں کئی سال لگ جاتے ہیں لیکن کئی ایک خوش قسمت ایکٹریسیں ایسی بھی ہیں جو ایک ہی رات میں کامیابی کے تمام مراحل طے کر لیتی ہیں۔ ہر فلم کمپنی ایکٹریس پر چلتی ہے۔ فلمی زندگی کا محور یہی قبالہ ہے ——!

ایکٹروں کی طرح ایکٹریسیں بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ چھوٹی اور بڑی ——! چھوٹی ایکٹریس اکثر اپنے بھائی یا شوہر کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔ بڑی ایکٹریس پروڈیوسر کی کار میں۔ کیونکہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہوتا۔ کوئی بھائی نہیں ہوتا۔ بڑی ایکٹریس کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سیٹ پر آکر سو جاتی ہے اور اس کا موڈ اکثر بگڑ جاتا ہے ——!

اس لئے کہو۔ الف سے ایکٹریس...

الف سے اوٹ !

فلمی پردے کی اوٹ میں کیا ہوتا ہے۔ یہ نہ پوچھو تو بہتر ہے۔ جگمگاتے ہوئے

فلمی پردے کے پیچھے کتنا اندھیرا ہے اس کا بیان بہت مشکل ہے۔ پردے کی اوٹ میں ہیرو اور ہیروئن شاید ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں لیکن پردے پر آکر ایک دوسرے سے محبت کرنے پر مجبور ہیں ــــ! ایک ایکسٹرا دو دن کا بھوکا ہے۔ لیکن فلم کے پردے پر وہ کھانے سے بھری ہوئی تھالی کو ٹھوکر مارنے پر مجبور ہے کیونکہ اسے پارٹ ہی ایسا دیا گیا ہے! وہ عورت جو فلم میں ایک شریف گرہستن بنی ہوئی اپنے خاوند سے لاتیں کھا رہی ہے۔ گھر جاکر ہر روز اپنے شوہر کو پیٹتی ہے!

اس لئے صرف پردے کی چمک ہی کو مت دیکھو۔ اس کی اوٹ کو بھی یاد رکھو اور کہو ــــ الف سے اوٹ!

الف سے اشتہار!

کوئی فلم اشتہار کے بغیر نہیں چل سکتی۔ فلم بنانے سے پہلے اشتہار دینا



پڑتا ہے۔ فلم بننے کے دوران میں اشتہار دینا پڑتا ہے۔ فلم بننے کے بعد تو دھڑا دھڑ اشتہار دینے پڑتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے فلم کی کامیابی کا یہ فارمولا بنا رکھا ہے۔

ہیرو۔ ہیروئن اور اشتہار ....!

ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو فلمی ہیرو اور ہیروئن بھی سیکس (SEX) اور گلیمر کے اشتہار معلوم ہوتے ہیں۔ گویا فلم میں جو کچھ ہے اشتہار ہی اشتہار ہے۔ باقی سب آزار ہے ——— اسی لئے تو بعض فلم اسٹار اشتہار کے لالچ میں اس قدر بڑھ جاتے ہیں کہ ان کی ساری زندگی ایک کھلا اشتہار معلوم ہوتی ہے۔ وہ انسان نہیں اخبار کا ایک ورق معلوم ہوتے ہیں ——— !

الف سے اشتہار !

ب سے باورچی :-

ہر فلمی عورت جس کا سماجی درجہ ہیروئن سے کم ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ ایک باورچی لئے پھرتی ہے۔ یہ باورچی بیک وقت خاوند، پہرہ دار، عاشق اور غنڈے کے فرائض انجام دیتا ہے اور بلا تفریق مذہب وملت انجام دیتا ہے — باورچی ہندو بھی ہوتا ہے، مسلمان بھی ہوتا ہے، عیسائی بھی ہوتا ہے اور اگر ضرورت آن پڑے تو سکھ بھی بن جاتا ہے۔ اپنے گھر میں دھوتی، پائجامہ اور شلوار وغیرہ میں ملبوس دیکھا جاتا ہے لیکن اسٹوڈیو میں کوٹ پتلون پہنے نظر آتا ہے۔ کلائی پہ سونے کی گھڑی۔ ہاتھ میں 555 کا ڈبہ اور گلے میں سرخ رومال باندھے رکھتا ہے گھر پر فلمی لڑکی کا سگا بھائی ہوتا ہے۔ اس کا باپ ہوتا ہے۔ ڈرائیور ہوتا ہے۔ باورچی بھی ہوتا ہے لیکن اسٹوڈیو میں آکر صرف باورچی کہلاتا ہے۔ پروڈیوسر لوگ اس خطرے کی جھنڈی سے بہت ڈرتے ہیں اور اسے منہ مانگی تنخواہ دیتے

ہیں۔ جس کا فلمی لڑکی کے کانٹریکٹ میں کوئی ذکر نہیں ہوتا ۔۔۔۔ عشق کی طرح
بابوجی پر بھی زور نہیں ہے کیونکہ یہ وہ آتش ہے غالب جو لگائے نہ لگے اور
بجھائے نہ بنے۔

پھر ب سے بمبئی !

جو ہندوستانی فلمی صنعت کا مرکز ہے۔ ب سے بنڈل ہے جو بمبئی کے
فلمی عوام کا نعرہ ہے .... یہ پکچر کیا ؟ بنڈل ! یہ ڈائریکٹر کیا ؟ بنڈل !
یہ گانا کیسا ؟ بنڈل ! یہ ایکٹر کیا ؟ بنڈل ! ۔۔۔۔ الغرض جو کچھ آپ ناپسند
فرمائیں۔ وہ بنڈل بلکہ بوگس ہے، بکواس ہے ۔۔۔۔ !

.کھ سے بھروسہ ہنڈریڈ پرسینٹ !

زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھروسہ کبھی آدھا
ادھ کچرا ہوتا ہے۔ کبھی نامکمل سا۔ کبھی یوں ہی سا۔ کبھی پورا کا پورا ۔۔۔۔ یہ
زندگی کے حالات پر منحصر ہے کہ کون حالات میں کتنا بھروسہ ہوتا ہے۔ مگر فلمی زندگی
میں ہمیشہ بھروسہ رکھنا پڑتا ہے اور ادھ کچرا نہیں بلکہ بالکل مکمل بھروسہ کرنا
پڑتا ہے۔ فلمی اصطلاح میں اسے "بھروسہ ہنڈریڈ پرسینٹ" کہتے ہیں ۔۔۔!

مثال کے طور پر ایک ایکٹر کسی فلم پروڈیوسر کے دفتر میں گیا۔ دونوں نے
ہات ملائے۔ گلے ملے۔ ایک دوسرے کا منہ چوما۔ پھر ایکٹر نے فلم پروڈیوسر
کی کمر میں ہات ڈال کے کہا۔

"پیارے سنا ہے تو پکچر شروع کر رہا ہے ؟"

"ہاں میری جان !"



"تو ہمیں کام نہیں دے گا ۔ ڈارلنگ ؟"

"پکچر کس کے لئے بنا رہا ہوں ۔ سوئٹ ہارٹ !"

"تو میرا رول کدھر ہے ۔ ہنی ؟"

"ادھر ہے ۔ جانی !" فلم پروڈیوسر نے اپنے دل پر ہات رکھ کر کہا ۔ اگلے بدھ وار کو آجاؤ ۔ اور کانٹریکٹ سائن کر جاؤ ۔ پیارے !"

"پکا ــــــ ؟"

"بھروسہ ہنڈریڈ پرسینٹ !"

اگلے بدھ کو ٹھیک وقت پر ایکٹر فلم پروڈیوسر کے گھر پہنچ گیا۔ فلم پروڈیوسر کسی ضروری کام سے عین اسی وقت چلا گیا تھا۔ مگر ایکٹر کے لئے پیغام رکھ گیا تھا۔ "اگلے بدھ کو ضرور آ جانا۔ تمہارا کام ہو جائیگا۔ بھروسہ ہنڈریڈ پرسینٹ !"

ایکٹر اگلے بدھ کو بھی گیا۔ اس سے اگلے بدھ کو بھی۔ اتنے بدھ کو گیا کہ اس کی ساری سُدھ بُدھ ماری گئی۔ اور کام پھر بھی نہیں ملا۔ فلم پروڈیوسر نے دوسری فلم شروع کر دی۔ اب اس دوسری فلم میں اس ایکٹر سے وعدہ کر لیا گیا ہے کہ اسے کام ضرور ملے گا۔ بھروسہ ہنڈریڈ پرسینٹ !

یہ بھروسہ ہنڈریڈ پرسینٹ بڑی خطرناک چیز ہے۔ فلمی دنیا میں جہاں کسی نے آپ سے کہا۔ "بھروسہ ہنڈریڈ پرسینٹ" سمجھ لو۔ آپ کا کام نہیں ہوگا—— !

اگر بھروسہ ففٹی پرسینٹ ہو، یا اس سے بھی کم ہو تو کام ہونے کا چانس زیادہ ہے —— لیکن اگر کہیں خدا نہ کرے بھروسہ ہنڈریڈ پرسینٹ ہو گیا تو آپ مارے گئے—— ! زندگی بھر جو کہیں آپ کا وہ کام ہو جائے !

اس لئے فلم میں آنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نہ کسی دوسرے پر بھروسہ کریں ہنڈریڈ پرسینٹ ، نہ اپنے آپ پر بھروسہ کریں ہنڈریڈ پرسینٹ اگر آپ یوں سوچکر آگے بڑھیں گے تو ضرور کامیاب ہوں گے !

بس یہی ایک گر کی بات ہے اور میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھ پر بھروسہ کیجئے ہنڈریڈ پرسینٹ !

بھ سے بھروسہ ہنڈریڈ پرسینٹ !

باپ سے پروڈیوسر !

پروڈیوسر فلم بنانے والے کو کہتے ہیں۔ مگر کیوں کہتے ہیں ؟ —— یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیونکہ آجکل ایک پروڈیوسر فلم کم بناتا ہے۔ قرضہ زیادہ چڑھاتا ہے۔ فلم بناتے وقت بڑے بڑے آرٹسٹوں کو بڑی بڑی تھیلیاں دینے کے بعد اس بیچارے کے پاس بچتا ہی کیا ہے ؟

ایک زمانہ تھا کہ فلم انڈسٹری میں پروڈیوسر کی بڑی دھوم تھی۔ فلم کمپنی کے دفتر میں، اسٹوڈیو میں، سیٹ پر لوگ اسے دیکھتے ہی رعب سے کانپنے لگتے تھے۔ ہیرو اور ہیروئن۔ موسیقار اور شاعر ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے تھے۔ جدھر سے وہ گذرتا تھا لوگ اس کے سامنے جھک جاتے تھے۔ آج جدھر سے وہ گذرتا ہے اُسے جھکنا پڑتا ہے۔

اسٹوڈیو میں ہیرو اپنی لمبی گاڑی سے پہچانا جاتا ہے۔ ہیروئن اپنی اماں سے پہچانی جاتی ہے۔ پروڈیوسر کو پہچاننے کا طریقہ بہت آسان ہے۔ اگر کسی فلم کی شوٹنگ کے دوران آپ کو کوئی ایسا آدمی نظر آئے جو سب سے اُداس پریشان۔ پھٹے حال۔ دُکھی۔ مظلوم۔ مجبور۔ ڈرا اور سہما ہوا دکھائی دے تو سمجھ لیجئے کہ یہی اس فلم کا پروڈیوسر ہے۔

جو اناڑی باہر سے آتے ہیں۔ پروڈیوسر بننے کا شوق اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ مگر نہیں جانتے کہ پروڈیوسر بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کو قارون کا خزانہ سفیر کا دماغ اور کسی مہارشی کا گیان حاصل ہو۔ اگر آپ میں یہ تینوں خوبیاں موجود ہیں تو آپ پروڈیوسر بن سکتے ہیں اور فلم کمپنی کے بورڈ پر لکھ سکتے ہیں۔

باپ سے پروڈیوسر !

ت سے تقدیر:۔۔۔

ت سے تقدیر ہوتی ہے جس کے بنا کوئی تصویر نہیں چلتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تصویر دلیپ کمار سے چلتی ہے یا راجکپور سے یا دیوآنند سے یا دیجنتی مالا سے یا مینا کماری سے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ تصویر مکھ رام شرما کی کہانی سے چلتی ہے یا بمل رائے کی ڈائریکشن سے یا نوشاد کے سنگیت سے یا مجروح اور شلیندر کے گانوں سے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر تصویر کو اچھی پبلسٹی مل جائے اور وہ کسی بڑے سینما ہال میں لگا دی جائے تو خود بخود چل جاتی ہے۔ مگر یہ سب باتیں غلط ہیں۔ اصل میں تصویر صرف تقدیر سے چلتی ہے۔ اور تقدیر کا ٹھیکہ بمبئی میں دو سادھوؤں نے لے رکھا ہے۔ ایک ہیں



بھجنگ بابا۔ دوسرے ہیں دبنگ بابا۔ سب فلم والے اپنی تقدیر پوچھنے کے لئے انہی دو باباؤں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے اپنی تقدیر کا کوٹہ لے کر آتے ہیں۔ کسی کو کم ملتا ہے، کسی کو زیادہ۔ مگر ملتا انہی سے ہے۔ ان دونوں باباؤں کے دیو استھان الگ الگ مقرر ہیں۔

آدھے فلم بنانے والے بھجنگ بابا کے قائل ہیں۔ آدھے دبنگ بابا کے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فلم بنانے والا جو اس سے پہلے بھجنگ بابا کا قائل تھا، اپنی فلم کے فیل ہو جانے پر دبنگ بابا کی شرن میں چلا جاتا ہے۔ اور دبنگ بابا کو ماننے والا اُن سے ناامید ہو کر بھجنگ بابا کا مُرید ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے چڑھاوؤں کی مجموعی تعداد میں کیا فرق پڑتا ہے؟

پچھلے سال سے ایک اور بابا وارد ہوئے ہیں...... ٹکانگ بابا——

پہلے انہوں نے اپنی کٹیا بھجنگ بابا کے دیو استھان کے سامنے بنائی مگر دوسرے دن اکھاڑ کر پھینک دی گئی۔ پھر انہوں نے دبنگ بابا کے سامنے جا کے دھونی رمائی۔ وہاں سے بھی بہ یک بینی و دو گوش نکالے گئے۔ اب یہ شہر سے چھ میل باہر ندی کے کنارے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھے ہیں اور ان کا دھندا بھی چل نکلا ہے۔ وہ بات تو نہیں ہے جو بھجنگ بابا یا دبنگ بابا میں ہے۔ مگر ہاں چھوٹی چھوٹی تیسرے درجے کی فلمیں بنانے والے اس تیسرے بابا کے پاس جانے لگے ہیں اور اپنی تقدیر کی مرمّت کرانے لگے ہیں۔

مگر اتنی بڑی فلم انڈسٹری کے لئے تین سادھو بہت کم ہیں۔ سوچتا ہوں میں پتنگ بابا بن جاؤں۔ سر پہ راکھ اور منہ میں خاک ڈال کر لوگوں پر اپنی دھاک جماؤں اور چٹکی دے کر کہوں۔ لے بچہ!

تت سے تقدیر........!

ستاسے تکون !

ایک جیامیٹری کی تکون ہوتی ہے۔ ایک محبت کی تکون ہوتی ہے .....
جیسے ہیرو، ہیروئن اور ہوٹل .... یہ تینوں مل کر محبت کی تکون بناتے ہیں
جیسے ولین: ایکسٹرا لڑکی اور سمندر کے ملنے سے محبت کی دوسری تکون بنتی ہے۔

ایک تکون کہانی میں بھی بنائی جاتی ہے جیسے ہیرو، ہیروئن، ولین! کبھی ولین ایک آدمی ہوتا ہے۔ کبھی سماج ہوتا ہے۔ کبھی حالات ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی حادثہ ہوتا ہے — ! یہ ولین ہیرو اور ہیروئن کو ملنے نہیں دیتا۔ اس کی وجہ سے تکون کھڑی رہتی ہے۔ ولین کو ہٹا دیجئے۔ تکون بیٹھ جائے گی اور



فلم بھی پہلے سین میں ختم ہو جائے گی۔ اس لئے ہر کہانی میں تکون کا ہونا ضروری ہے۔

ایک تکون فلمی بزنس کی بھی ہوتی ہے۔ جیسے فنانسر، پروڈیوسر، ڈسٹری بیوٹر! اس تکون میں پروڈیوسر اور ڈسٹری بیوٹر دونوں مل کر فنانسر کے برابر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اس تکون میں کوئی ہیروئن آ جاتی ہے اور تکون کے بجائے چوکون بن جاتی ہے اور فلم نامکمل رہ جاتی ہے کیونکہ چوکون سے جیامیٹری کی شکل تو بن سکتی ہے فلم نہیں بن سکتی۔ فلم کے لئے صرف تکون چاہیئے۔

پرانے شاستروں میں لکھا ہے کہ یہ دنیا ایک بیل کے سینگ پر کھڑی ہے۔ پتہ نہیں یہ خبر کہاں تک سچ ہے۔ لیکن یہ تو بالکل سچ ہے کہ ہماری فلم انڈسٹری محبت کی تکون پر کھڑی ہے!

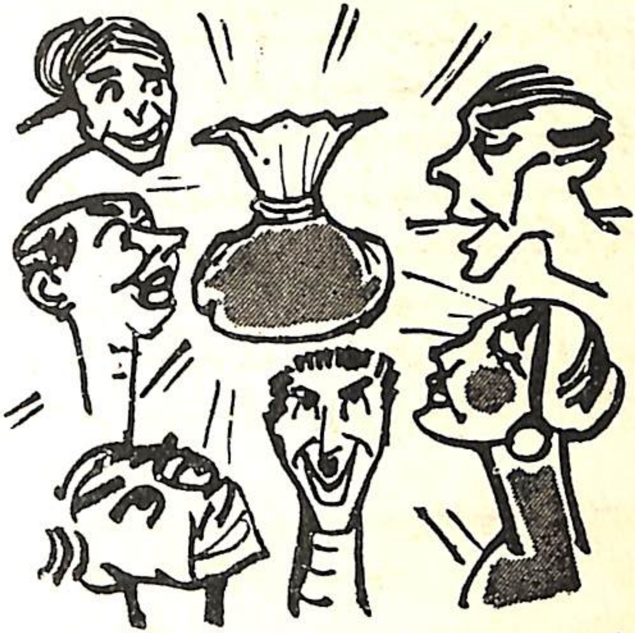
اس لئے اگر فلم بنانا ہے تو ایک طرف سے ہیرو کو لائیے دوسری طرف سے ہیروئن کو۔ بیچ میں ولین کو پھنسائیے، اور کہیئے —

ست سے تکون!

تھ ستے تھیلی!

ت ست تھیلی ہوتی ہے مگر نظر کس کو آتی ہے اور ملتی کس کو ہے؟ سارا جھگڑا اسی تھیلی کا ہے۔ اس دنیا میں! فلم والے بھی اس دنیا سے باہر نہیں ہیں، اس لئے ہر وقت تھیلی کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ نہ تو عوام کا اخلاق سدھارنے کے لئے پکچر بناتے ہیں نہ ان کے ذوقِ نشاط کو سنوارنے کے لئے۔ وہ صرف تھیلی کے لئے فلم بناتے ہیں۔

مجنوں جنگل میں لیلیٰ لیلیٰ پکارتا گھومتا تھا۔ فلمی جنگل کے مجنوں "تھیلی تھیلی" کہتے گھومتے ہیں۔ لیلیٰ کا ملنا آسان ہے مگر تھیلی کا ملنا بہت مشکل ہے۔ اس



لیے فلمی دُنیا میں اکثر لوگوں کی زندگی ایک تھیلی سے شروع ہوتی ہے اور ایک تھیلے پر ختم ہوتی ہے جس میں وہ گھر کے لیے سبزی ترکاری بھر کر اپنی کمر سے لٹکائے بازاروں میں گھومتے ہیں اور بزبانِ حال کہتے ہیں۔

مانگی تھی تو سے تھیلی، مل گیا تھیلا!

ٹ سے ٹاکی!

آجکل کی فلموں کو "ٹاکی" کہا جاتا ہے۔ یعنی بولتی فلمیں! ایک زمانہ میں سائلینٹ یعنی خاموش فلمیں بنتی تھیں۔ جن کا اور کوئی فائدہ ہو نہ ہو --- ایک فائدہ ضرور تھا کہ ان فلموں میں عورت بول نہیں سکتی تھی! اور میرے خیال

ہیں دنیا میں یہی ایک جگہ ایسی تھی جہاں عورت بول نہیں سکتی تھی۔ اسی لئے اس
زمانے میں شریف لوگ گھر کی جھائیں جھائیں سے گھبرا کر سینما ہال کا رُخ کرتے
تھے اور ٹکٹ خرید کر تین گھنٹے تک ایک خوبصورت عورت کو چپ چاپ فلم
میں کام کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔ آجکل تین گھنٹے تو کیا تین منٹ تک خاموش
رہنے والی عورت کا ملنا مشکل ہے کیونکہ آجکل فلمیں بولنے لگی ہیں اور بولنے
والی فلموں میں بھی آجکل ایسے ٹائپ کی فلمیں بننے لگی ہیں جنھیں فیملی پکچرز کہا
جاتا ہے۔ ان فلموں میں نہ صرف عورت بولتی ہے بلکہ اس کے بچے بھی بولتے
ہیں۔ اس کی بہنیں بھی بولتی ہیں۔ اس کے ماں باپ، ساس سسر، بھائی بھتیجے،
نندیں بھابھیاں سب کبھی باری باری اور کبھی اکٹھی بولتی ہیں اور سینما دیکھنے



والے کو محسوس ہوتا ہے کہ جس گھر سے وہ بھاگ کر آیا تھا۔ پھر اُسی گھر میں لوٹ گیا ہے۔

بولنے والی فلموں کے بعد سنا ہے اب سونگھنے والی فلمیں SMELLIES بننے لگی ہیں۔ ان فلموں میں جب ہیروئن اپنے کپڑوں میں عطر لگائے گی تو اس کی خوشبو آپ تک پہنچا دی جائے گی۔ جب ہیرو کسی ہوٹل میں کھانا کھائیگا تو کھانے کی خوشبو آپ تک آجائے گی۔ کسی باغ کا منظر دیکھ کر آپ نہ صرف مختلف پھولوں کو دیکھ سکیں گے بلکہ ان کی خوشبو بھی سونگھ سکیں گے۔ ایسی فلمیں تیار ہو رہی ہیں!

اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ سونگھنے والی فلموں کے بعد ایسی فلمیں تیار ہونے لگیں جنھیں "کھانے پینے والی" فلمیں کہا جا سکے یعنی ادھر ہیرو نے گلاس اُٹھایا ادھر جام آپ تک پہنچ گیا۔ ہیروئن نے تھالی پروسی اور کھانا آپ تک پہنچ گیا۔ ممکن ہے اس وقت لوگ فلم دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنا لنچ اور ڈنر بھی سینما ہال میں کھایا کرینگے!

مگر وہ زمانہ ابھی دور ہے۔ ابھی تو بولنے والی فلمیں دیکھئے اور سنئے اور اس کے بعد اگر ہمت ہو تو کہیئے۔

ٹ سے ٹاکی!

ٹھ سے ٹھگ!

آپ نے بنارسی ٹھگ کا نام سنا ہوگا۔ میں نے بھی بچپن سے سن رکھا تھا لیکن دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے ایک دفعہ میں اپنے دفتر سے تین مہینے کی چھٹی لے کر بنارس گیا ٹھگ دیکھنے کے لئے۔ سارا بنارس چھان مارا۔ کہیں پر کوئی ٹھگ

نہیں ملا۔ آخر ترلوکی گھاٹ پر گنگا کے کنارے مجھے ایک بوڑھا ٹھگ رام نام جپتا ہوا مل گیا۔ کیونکہ وہ ٹھگی چھوڑ چکا تھا۔ جب اس نے میری بپتا سنی تو اس نے میرے سر پر ہات رکھا اور بڑی شفقت سے بولا۔ "بیٹا! تیری تلاش فضول ہے تجھے اب بنارس میں کوئی ٹھگ نہیں ملے گا۔ کیونکہ بنارس میں جتنے ٹھگ رہتے سب کے سب بمبئی چلے گئے ہیں فلمی دنیا میں۔ تو اگر سچ مچ ٹھگوں کو دیکھنا چاہتا ہے تو ٹکٹ کٹا کر ابھی بمبئی چلا جا۔ وہیں تیرے من کی مُراد پوری ہوگی۔

میں نے اس بڈھے نیک ٹھگ کے آگے سیس نوایا اور اسی وقت اسٹیشن آیا۔ اور بمبئی کا ٹکٹ کٹانے کے لئے جیب میں ہات ڈالا تو معلوم ہوا۔ بٹوا



غائب ہے !

خیر میں کسی نہ کسی طرح سے بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی سینٹرل کے باہر نکلتے ہی مجھے ایک آدمی نے گھیر لیا۔ بولا۔

"ہیرو بنے گا؟"

میں نے کہا "میرا چہرہ تو گھوڑے کے مافق ہے۔ ہم کیسے ہیرو بنے گا؟"

وہ بولا۔ "واندہ نہیں!" پھر میری بیوی کی طرف دیکھ کر بولا "اپنی بی بی کو ہیروئن بنائے گا؟"

میں نے کہا "یہ بے چاری چھ بچوں کی ماں ہے!"

"واندہ نہیں" وہ سر ہلا کر پھر بولا "تیرے بچوں کو فلم میں کام دلائیگا۔ ڈبزی ایرانی بنا دے گا۔ !"

میں نے کہا "میرے سب بچے اسکول جاتے ہیں!"

وہ بولا۔ "واندہ نہیں!" —— پھر میرے بالکل قریب آکر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "پکچر بنائے گا؟"

میں نے کہا۔ "پکچر کتنے میں بنتی ہے؟"

"پانچ لاکھ میں بھی بنتی ہے اور پچاس لاکھ میں بھی بنتی ہے"۔ وہ بولا۔

"میرے پاس تو پانچ ہزار بھی نہیں!"

"واندہ نہیں" وہ بولا "تم تین ہزار نکالو۔ ہم باقی کا پارٹنر لاکے دیتا ہے"

"مگر میرے پاس تو تین سو بھی نہیں ہیں!"

اس نے تیز چبھتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ایک انگلی اٹھا کر بولا۔ "سیٹھ تیرے مستک پر سلور جبلی لکھا ہے۔ تو پکچر بنائے گا تو لاکھوں کمائیگا۔

اس لیئے بولتا ہے ہم تم کو .... لا - تیس روپے ہی نکال - ہم باقی کا ایڈوانس اپنی جیب سے ڈال کر تیس ہزار ٹانگ میں تیری فلم کمپنی کا پاٹیہ لگاتا ہے - تیرا نام کیا ہے ؟"

"گھاسی رام!"

"بہت اچھا نام ہے" - وہ بڑی سنجیدگی سے سر ہلا کر بولا "ہم تیرے نام پر تیری کمپنی کا نام رکھے گا - دی گریٹ گھاس لیمٹڈ کمپنی آف مووی میکرز! بول کیا نام ہے ؟

"بہت اچھا نام ہے - مگر میرے پاس تیس روپیے بھی نہیں ہیں - صرف پانچ روپے ہیں!"

تیرے مستک پر سلور جبلی لکھا ہے - اس لئے ہم تیرے سنگ اتنا ماتھا پھوڑی کرتا ہے - ورنہ ہم تیرے سنگ بات نہیں کرتا تھا" وہ آدمی بڑی شفقت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا - "اچھا - پانچ روپے ہی نکال - گاڑی بھاڑا کے لیئے - ہم ابھی ٹیکسی لے کے جاتا ہے اور ایک دلال کو لے کے آتا ہے - جو باقی پانچ لاکھ کا بندوبست کرے گا - تیری فلم کمپنی کے لئے — !

جب وہ مجھ سے پانچ روپے لے چکا - تو بولا "ہم ابھی آدھے کلاک میں آتا ہے !"

وہ چلا گیا اور مجھے پانچ لاکھ کے سپنوں میں کھویا ہوا چھوڑ گیا - میں نے طے کیا کہ ان پانچ لاکھ سے میں سب سے پہلے اپنے لئے ایک گاڑی لونگا - پھر ایک فلیٹ لونگا - پھر سوچنے لگا کہ میں اپنی فلم میں سادھنا کو لونگا کہ آشا پاریکھ کو ؟ اسی ادھیڑ بُن میں آدھا کلاک گذر گیا - پھر پورا کلاک گذر گیا - پھر سارے کلاک کی ساری سوئیاں گھوم گئیں - مگر وہ نہ آیا میرے من کا میت! آخر میں نے

بھوک سے چلّا کر کہا۔
ٹھ سے ٹھگ!

ٹھ سے ٹھرّا!

ٹھرّا ایک عجیب قسم کی دوا کا نام ہے۔ اس دوا کا فارمولا بہت خفیہ رکھا گیا ہے۔ یہ دوا رات کی تاریکی میں سنسان جگہوں پر۔ سلگتی ہوئی بھٹیوں میں حکومت کے پہرے داروں کی نظر سے دور تیار ہوتی ہے اور پھر وہاں سے گندے پیپوں میں بند کر کے۔ موٹر کی ٹیوبوں میں بھر کر گلی گلی پہنچا دی جاتی ہے دیکھنے میں یہ دوا پانی کی طرح ہوتی ہے۔ چکھنے میں آگ کی طرح!

ٹھرے کو بڑے بڑے فلمی لوگ نہیں پیتے۔ اسے صرف فلمی جنتا استعمال کرتی ہے۔ جیسے وہ جنتا گاڑی استعمال کرتی ہے جو صرف غریب لوگوں کے لئے ہے آج کل غریب لوگوں کا زمانہ ہے یعنی جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اس لئے غریب لوگوں کو فاقے۔ بے روزگاری۔ مہنگائی اور اسی قسم کی دوسری سہولتیں مہیا کرنے کے بعد ہم نے ان کے لئے ٹھرا بھی مہیا کر دیا ہے جسے پی کر وہ چند گھنٹوں کے لئے اپنے مصائب و آلام بھول کر کسی دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہی کام فلم سے بھی لیا جاتا ہے۔ گویا جو ہندوستانی فلم ہے وہ ایک طرح کا ٹھرّا ہی ہے۔

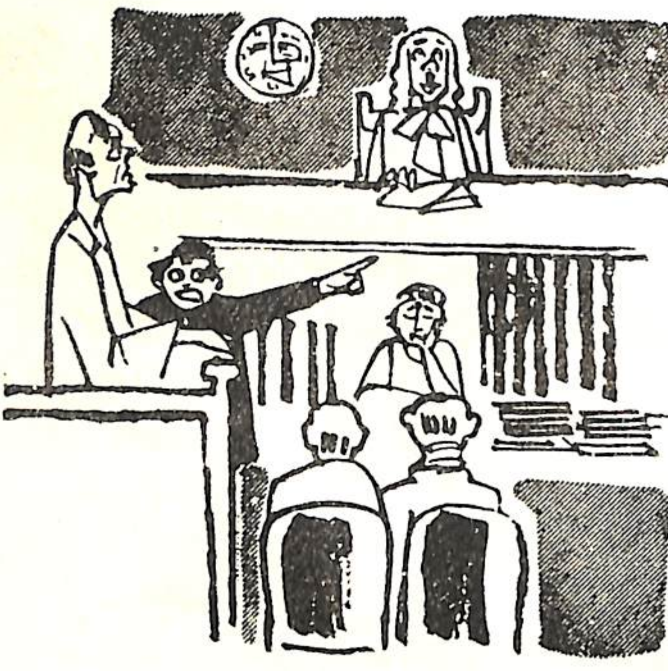
اب یہ آپ کی پسند پر ہے۔ جی چاہے تو ٹھرّا پیجئے۔ جی چاہے تو ٹھرّا دیکھیے۔ ہو سکے تو دونوں کیجئے اور دعا کیجئے۔ اس سمے کو جس میں آپ پیدا ہوئے ہیں۔

ٹھ سے ٹھرّا ——!

شسے ثبوت !

اگر آپ وکیلوں کا گون پہن کر ہائی کورٹ میں جرح کرنے جاتے ہیں تو یہ کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ آپ ایل ایل بی ہیں اور آپ کے پاس قانون کی ڈگری موجود ہے!

لیکن اگر آپ کسی فلم کے پروڈیوسر ہیں تو یہ کسی ایسی بات کا ثبوت نہیں ہے کہ آپ کے پاس فلم کے آرٹ کی کسی طرح کی جانکاری موجود ہے یا کسی قسم کا فلمی تجربہ، یا اس کی ٹیکنک سے واقفیت۔ یہ محض اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ نے یا تو کسی



لنگڑے سیٹھ کو پھانس لیا ہے اور یا کہیں سے بلیک کا بڑا ہات لگا ہے!

فلمی دنیا میں اس طرح کے اور بھی بہت سے ثبوت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ کے پاس ایک گاڑی ہے تو یہ کسی امر کا ثبوت نہیں ہے۔ فلمی دنیا میں گاڑی تو ہر جانے پہچانے آدمی کے پاس ہوتی ہے!

لیکن اگر آپ کے پاس ایک کیڈلاک ہے تو آپ یقیناً اچھے فنکار ہیں۔ شیورلیٹ ہے تو بڑے فنکار ہیں اور اگر امپالہ ہے تو یہ اس کا عظیم ثبوت ہے۔ کہ آپ ایک عظیم فنکار ہیں!

اگر آپ کسی فلمی رسالے میں کسی پروڈیوسر کا یہ اعلان پڑھیں کہ میں تو فلاں ہیروئن کو اپنی بیٹی برابر سمجھتا ہوں۔ یا اگر کوئی ہیرو اعلان کردے کہ فلاں ہیروئن کو میں اپنی بہن سمجھتا ہوں تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

اگر کوئی ہیروئن یہ بیان دے کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے اور اس کے متعلق شادی کی جو افواہیں مشہور ہو رہی ہیں وہ سب غلط ہیں۔ تو یہ اس امر کا بدیہی ثبوت ہے کہ اس ہیروئن کی شادی ہو چکی ہے!

فلمی دُنیا میں جو کہا جاتا ہے وہ ثبوت نہیں ہوتا بلکہ جو نہیں کہا جاتا وہ ثبوت ہوتا ہے!

اس لئے کہو۔

ث سے ثبوت!

ج سے جادو!

جادو کی فلمیں بہت بنتی ہیں ہمارے ملک میں۔ کیونکہ اس دیس میں کاہل اور کام چور بہت رہتے ہیں اس لئے ہر کام جادو کے چھو منتر سے کرا لینا چاہتے

ہیں۔اس لئے ایسی فلمیں دیکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ان میں جادو ٹونے کا کام بہت دکھایا جاتا ہے۔ منتر پڑھا تو ہیرو ہوا میں اڑنے لگا۔ منتر پڑھا تو ہیروئن کا محل اپنی جگہ سے اٹھ کر کسی پہاڑ کی چوٹی سے جا لگا۔ منتر پڑھا تو پانی کا دریا آگ کے دریا میں تبدیل ہو گیا۔ ایسی فلموں میں آدمی کچھ کام نہیں کرتے۔ وہ صرف منتر پڑھتے ہیں۔ باقی سب



کام جن کرتے ہیں ۔ وہی سڑکیں بناتے ہیں ۔ وہی عمارتیں وہی پہاڑ کاٹتے ہیں ۔ اور سمندروں پر پل باندھتے ہیں ۔ آدمی صرف محبت کرتے ہیں یا نفرت کرتے ہیں یا ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہیں !

ایسی فلموں میں ہیرو یا ہیروئن کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی ۔ اگر ہیرو کسی وجہ سے اکڑنے لگتا ہے تو اسے فوراً جادو کا ڈنڈا دکھا کے مکھی بنا دیا جاتا ہے ہیروئن نخرے دکھانے لگتی ہے تو اُسے جادو کے زور سے مینا بنا کر کسی پنجرے میں ڈال دیا جاتا ہے ۔ اب کرو نخرے ! ساری فلم میں پنجرے میں ٹنگی رو یا کرو گی ! اسی لئے تو بڑے بڑے اداکار جادو کی کسی فلم میں کام نہیں کرنا پسند کرتے ! کیونکہ وہاں نخرے دکھانے کا موقعہ نہیں ملتا ــــــ !

ج سے جیوتشی بھی ہوتا ہے ۔ جس کے بغیر فلم کا کوئی کام شروع نہیں ہو سکتا ۔ فلم کا مہورت جیوتشی طے کرتا ہے ۔ ریلیز جیوتشی طے کرتا ہے ۔ پریمیئر جیوتشی طے کرتا ہے ۔ کس ہیرو کے ساتھ کون سی ہیروئن چلے گی ؟ ...... وہ جیوتشی طے کرتا ہے ۔ فلم کتنے ہفتے چلے گی ؟ وہ جیوتشی طے کرتا ہے اور اگر نہیں چلی تو کس "گرہ" کی وجہ سے نہیں چلی تو وہ بھی جیوتشی طے کرتا ہے اور بیچارہ پروڈیوسر تے کرتا ہے ! ــــ کہ وہ اور کر بھی کیا سکتا ہے ؟

فلمی جگت میں دو طرح کے جیوتشی پائے جاتے ہیں ۔ پُرانے ــــــ وہ جو آسمان کے ستاروں کو دیکھ کر کنڈلی بناتے ہیں ۔ نئے ــــــ وہ جو فلمی ستاروں کو دیکھ کر نکشتر جماتے ہیں !

پُرانے کہتے ہیں "آٹھویں گھر میں سورج ہے، چھٹے میں چندرماں ہے ۔ نویں میں بدھ ہے اور پانچویں میں برہسپت ہے ۔ پکچر ضرور سلور جُبلی کرے گی !"

نئے کہتے ہیں "پہلے گھر میں دلیپ ہے۔ دوسرے میں وحیدہ رحمان ہے تیسرے میں پران ہے۔ چوتھے میں جانی واکر ہے۔ پانچویں میں ٹیکنی کلر ہے۔ چھٹے میں ایس ڈی برمن ہے۔ پکچر چلے ہی چلے!

آجکل پرانے جیوتشیوں کی جگہ نئے جیوتشی لے رہے ہیں۔ اگر تم فلمی ستاروں کی چال سمجھتے ہو۔ اور کسی بڑے فلمی ستارے کو کسی فلمی کنڈلی کے گھر میں بٹھا سکتے ہو۔ تو تمہارا مستقبل محفوظ ہے۔ پھر زندگی بھر راہو اور کیتو تمہارے گھر کی طرف نہ دیکھیں گے!

اب جی چاہے تو ج سے کہو جادو۔ جی چاہے تو ج سے کہو جیوتشی۔ ایک ہی بات ہے!

جھوٹے جھانسے!

اسے سمجھنے کے لئے ایک گفتگو کا ٹیپ ریکارڈ سنو! ایک فلم کمپنی کے مالک اور جگن بھائی دلال کے درمیان......

مالک:- جگن بھائی۔ اپنی نئی پکچر کے لئے راجکپور کو لینا چاہتا ہوں۔ تمہارے تعلقات کیسے ہیں اس سے؟

جگن:- راجکپور تو سدا اپنی جیب میں رہتا ہے!

مالک:- اور وجینتی مالا؟

جگن:- وہ تو اپنی مٹھی میں ہے!

مالک:- اور پران؟

جگن:- اجی پران تو اپنا لنگوٹیا ہے!

مالک:- اور تیواری؟

جگن :- تیمادی تو اپنا بچہ ہے !

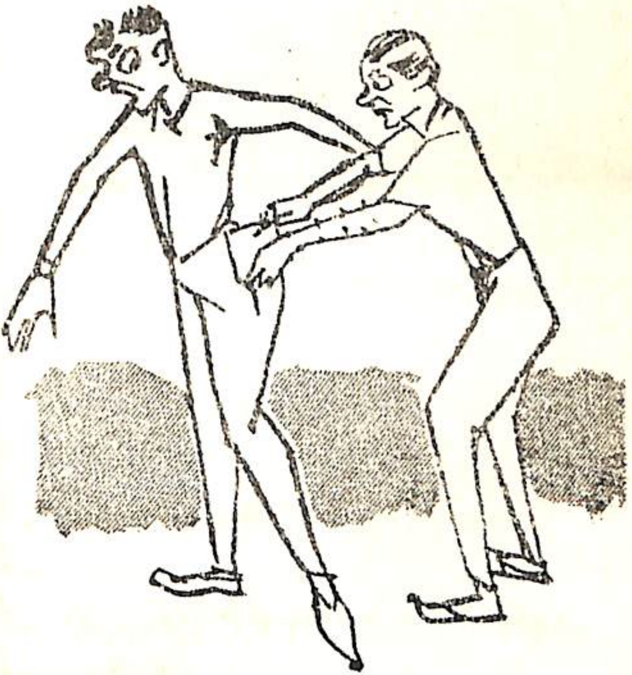
مالک :- مگر میری کہانی میں دو ہیرو ہیں ...... (سوچ کر) دیو آنند کیسا رہیگا ؟

جگن :- لے لو ...... میں تو اپنی ایک جیب میں دیو آنند کو رکھتا ہوں، دوسری جیب میں راجکپور کو !

مالک :- ذرا اپنی جیب تو دکھاؤ ؟

جگن :- (گھبرا کر) کیا مطلب ؟

(کمپنی کا مالک جلدی سے جگن بھائی کی پتلون کی دونوں جیبوں میں ہات



ڈال کے انھیں الٹا دیتا ہے)۔

مالک :- ارے جگن بھائی۔ تمہاری جیب میں تو صرف دو کھوٹی چونیاں ہیں!

یہ فلمی جھانسے کی ایک معمولی سی مثال ہے۔ زندگی کے دوسرے کاروبار میں بھی جھانسہ ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ہوتا ہے اور بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ مگر فلمی دنیا کے داؤ کا ہر پانسہ ایک جھانسہ ہوتا ہے اور بے حد معصوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جھانسہ دینے والا جانتا ہے کہ وہ جھانسہ دے رہا ہے۔ اور جس کو جھانسہ دیا جا رہا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ مجھے جھانسہ دیا جا رہا ہے۔ اس لئے کسی کو کسی سے نقصان نہیں ہوتا۔ کیونکہ فلمی دنیا میں کسی کو نقصان پہنچانے کی غرض سے کوئی جھانسہ نہیں دیا جاتا بلکہ محض ایک دوسرے کو خوش کرنے کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس لئے بچو! تم بھی خوش ہو کر یہ کھیل کھیلو۔ اور کہو۔

جھ سے جھانسہ!

چ سے چمچہ!

یہ وہ چمچہ نہیں ہے جو چائے میں شکر انڈیلتا ہے بلکہ وہ چمچہ ہے جو ہوتا تو آدمی ہے لیکن ہر وقت ہر وڈیوسر، ہیرو یا ہیروئن یا اپنے سے کسی بڑی اونچے درجے کے آدمی کے کان میں شکر انڈیلتا رہتا ہے، اور میٹھی میٹھی باتوں کا شہد گھولتا رہتا ہے۔ متواتر شکر انڈیلنے سے اس کی شکل بھی بالکل چمچے کی طرح ہو جاتی ہے۔ اسی لئے فلم کی اصطلاح میں ایسے آدمیوں کو 'چمچہ' کہتے ہیں۔

ہر بڑا آدمی اپنی گاڑی کی لمبائی اور اپنے چمچوں کی تعداد سے پہچانا جاتا ہے۔



معمولی بڑا آدمی ایک آدھ چمچہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ بہت بڑا آدمی آدھی درجن چمچے ہر وقت اپنی گاڑی میں ٹھونسائے رہتا ہے۔ متواتر شکر کھانے سے بڑے آدمیوں کو اکثر ذہنی ذیابطیس (MENTAL DIABETISE) کی بیماری ہو جاتی ہے اور اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ پھر کوئی کڑوی اور سچی بات نہیں سُن سکتے۔ یہ بھی چمچہ گیری کا کمال ہے!

سنتے ہیں شکر پر کنٹرول ہو چلا ہے۔ مگر چونکہ چمچوں پر کنٹرول نہیں ہے۔

اس لئے یہ لوگ بلیک سے شکر لاکر اپنے مالک کے کان میں انڈیلتے رہتے ہیں اور اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہتے ہیں ۔ مجھے ایک دفعہ ایک بہت بڑے فلمی آدمی کے گھر میں کھانا کھانے کا اتفاق ہوا ۔ کھانے کی میز انواع و اقسام کے کھانوں سے سجی ہوئی تھی ہر طرح کے ڈرنک موجود تھے ۔ قیمتی چائنا کی پلیٹوں سے ساری میز جگمگا رہی تھی مگر ہمارے میزبان نے جب میز دیکھی تو فوراً بھڑک کر غصے میں اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے کہا ۔

"یہ کیا بکواس ہے ؟ تم کو میز لگانے کو کہا تھا ۔ کیا میز اسی طرح سے لگائی جاتی ہے ؟"

وہ آدمی فوراً شرمندہ ہوکر بولا ۔

"حضور کیا غلطی ہوگئی اس خاکسار سے ؟"

مالک گرج کر بولا ۔ میں پوچھتا ہوں اس میز پر چمچے کیوں نہیں رکھے ؟"

اس پر وہ آدمی فوراً دست بستہ ہو کے بولا ۔"حضور ہمارے ہوتے ہوئے چمچوں کی کیا ضرورت ؟"

اس دنیا میں صرف دو طرح کے آدمی ہوتے ہیں ۔ ایک وہ جو چمچے ہوتے ہیں ۔ دوسرے وہ جو چمچے اپنے ساتھ رکھتے ہیں ۔ تیسری طرح کا آدمی کوئی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو اسے اس دنیا میں کوئی نہیں پوچھتا ۔ اس لئے بچو ! شکر کھاؤ اور شکر کھلاؤ ۔ اور کہو ۔

بچ سے چمچہ !

بچھ سے چھمیا !

فلمی دنیا میں چھمیا کی کمی ہر سمے محسوس ہوتی رہتی ہے ۔ پروڈیوسر

کہتا ہے: "ارے فلم کہاں سے بنائیں۔ کوئی چھمیا نظر نہیں آتی! کیمرہ مین کہتا ہے۔ "ارے کیمرہ کہاں چلائیں؟ کوئی چھمیا تو دکھائی دے! ڈسٹری بیوٹر کہتا ہے: "ارے اس فلم میں سب کچھ ہے بس ایک چھمیا نہیں ہے!"

ان لوگوں کی باتیں سن کر یہ خیال آتا ہے کہ "چھمیا" کوئی پارس پتھر ہوگا جس کے حاصل کرنے کے لئے فلم والے ہر وقت تڑپتے رہتے ہیں۔

مگر یہ بات نہیں ہے! چھمیا کا لفظ خوبصورت لڑکی کے لئے بولا جاتا



ہے! ایک دفعہ ایک فلم بنی تھی "چھمیا"۔ اس میں جس ہیروئن نے کام کیا تھا وہ لوگوں کو اس قدر حسین دکھائی دی کہ جب سے ہر سندری کو چھمیا کہا جانے لگا!

چھمیا کی تلاش میں فلم والے ہر سال حیدرآباد، لکھنؤ، کلکتہ، چنڈی گڑھ، دلی، کہاں کہاں ڈول ڈالتے رہتے ہیں مگر حسن تو ایک نایاب شے ہے۔ تیل کا کنواں کھود لینا آسان کام ہے مگر ایک چھمیا کو ڈھونڈھ نکالنا بہت مشکل ہے۔ چھمیا بڑی مشکل سے ملتی ہے اور جب ملتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک شوہر ہے یا ماں باپ ہیں! جو کسی طرح اپنی چھمیا کو فلم میں بھیجنے کے لئے راضی نہیں ہیں۔ ایسے موقعوں پر چھمیا کے ساتھ اس کے شوہر اور اس کے ماں باپ کو بھی کام دینا پڑتا ہے۔ کچھ لوگوں نے فلم میں کام حاصل کرنے کا یہ آسان گر دریافت کر لیا ہے کہ وہ اپنے ساتھ ایک چھمیا کو بھی لے آتے ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ چھمیا کے لئے چھمیا ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ ایکٹنگ کی صلاحیت بھی ہونی چاہیے اور تھوڑی سی عقل بھی چاہیے۔ اب قدرت نے یہ عجیب مذاق کر رکھا ہے وہ اگر کسی کو شکل دیتی ہے۔ تو عقل نہیں دیتی اور عقل دیتی ہے تو شکل نہیں دیتی۔ لیکن جس چھمیا کے پاس یہ دونوں چیزیں موجود ہوں۔ اس کا فلم میں ترقی کرنا کچھ مشکل نہیں ہے!

اس لئے ہر چھمیا کو فلم میں آنے سے پہلے دیکھ لینا چاہیئے کہ وہ اچھی شکل کے علاوہ اداکاری کرنے کی عقل بھی رکھتی ہے کہ نہیں ورنہ وہ چھمیا ایک دن بالکل نکمیا ثابت ہو گی! اس لئے چھ سے چھمیا ——!

ح سے حقہ!

فلمی دنیا میں کام کرنے والے ہمیشہ سگریٹ پیتے ہیں اور کبھی حقے کے نزدیک

نہیں جاتے۔ نہ گھر پر، نہ اسٹوڈیو میں، نہ دفتر میں، کہیں پر وہ اپنے استعمال کے لئے حقّہ نہیں رکھتے۔ صرف سگریٹ پیتے ہیں اور اپنے درجے، عادت، مزاج یا جیب کے مطابق سگریٹ کا شوق کرتے ہیں۔ نہایت ناکام لوگ نہایت اعلےٰ درجے کا سگریٹ پیتے ہیں اور جو انتہائی کامیاب ہیں اور لاکھوں کماتے ہیں۔ وہ سونے کے سگریٹ کیس میں صرف بیڑی ڈال کر پیتے ہیں۔ جو آدمی جتنا گھٹیا سگریٹ پئے گا اتنا ہی کامیاب اور مالدار سمجھا جائے گا۔ مگر حُقّے کو کوئی بھی ہات نہیں لگائے گا!

مگر جب ایکٹر مندر جانے لگے۔ ایکٹریس گھر پر دال بگھارنے لگے اور پروڈیوسر حُقّہ پینے لگے تو سمجھ لو کہ اُن کے بُرے دن آگئے۔ سمجھ لو کہ انھوں نے صبر کر لیا ہے اور اب وہ جلد ہی فلمی دنیا سے کنارہ کش ہونے والے ہیں۔ ایسے وقت میں پروڈیوسر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ اور زور کا ایک کش لے کر کہتا ہے۔

ح سے حُقّہ!

خ سے خالی!

فلم انڈسٹری میں کام کرنے والوں کی زندگی کا ایک حصہ کام کرتے ہیں اور بہت سا حصہ کام نہ کرنے میں خرچ ہو جاتا ہے مگر مزے کی بات یہ ہے کہ فلم انڈسٹری میں کبھی کوئی خالی ہات نظر نہیں آتا اور جو جتنا خالی ہوتا ہے یعنی جس کے پاس جتنا کام کم ہوتا ہے وہ اتنا ہی مصروف نظر آتا ہے۔

میں اپنے ایک دوست ایکٹر کو جانتا ہوں جس کے پاس پچھلے دو سال سے کوئی کام نہیں تھا اور جو ابھی چند دن ہوئے مجھ سے پچاس روپے مانگ کر لے گیا تھا۔ میں نے ایک پروڈیوسر کی منت سماجت کر کے اسے کام دینے پر

راضی کیا اور اسے ایکٹر کے گھر پر لے گیا —— ! خالی ایکٹر بڑے تپاک سے ملا ۔ وہ ضرور ہمیں چائے آفر کرتا ۔ مگر نوکر حجامت کرانے گیا تھا ۔ ضرور شراب پلاتا ۔ مگر کمبخت پرمٹ ختم ہو چکا تھا ۔ سگریٹ بھی پیش کرتا ۔ مگر جب سے اس نے امریکی ڈاکٹر ڈان کا بیان پڑھا تھا کہ سگریٹ پینے سے کینسر ہو جاتا ہے ۔ اس نے مہمانوں کو سگریٹ پیش کرنا بند کر دیا تھا ۔

خیر! آمدم برسرِ مطلب ۔ میں نے اُس سے کہا ۔" خالی ہو ؟ ایک رول کرو گے ؟"

"خالی —— ؟" وہ ایکٹر زور کا ایک قہقہہ لگا کے بولا —— "میں ؟ اور خالی ؟ —— آٹھ پکچریں ہیں ہمارے پاس —— دو چوپڑہ کی ۔ ایک کے آصف کی ۔ ایک بمل رائے کی ۔ تین واڈیا کی ۔ اور ایک نئے پروڈیوسر کی ۔ ابھی کل ہی کانٹریکٹ کیا ہے ۔ بیس ہزار میں —— !"

" تب تو آپ خالی نہیں ہیں " —— میں نے تقریباً آزردہ ہو کر اٹھتے ہوئے کہا ۔" ہم جانتے ہیں !"

ایکٹر نے فوراً مجھے ہات سے پکڑ کر بٹھا دیا ۔" کہاں جاتے ہو ؟ —— تم ان کو لے کے آئے ہو ۔ تو کسی نہ کسی طرح وقت تو نکالنا ہی پڑے گا تمہاری خاطر —— !"

" مگر یہ لوگ تو ایک چھوٹی سی پکچر بنا رہے ہیں " میں نے کہا ۔" دو ہزار سے زیادہ دام نہیں دے سکتے !"

" بڑی پکچر کے بڑے دام ۔ چھوٹی پکچر کے چھوٹے دام !" ایکٹر مسکرا کر بولا ۔ " اور پھر یہ تمہارے دوست ہیں ۔ تو سمجھو آج سے میرے بھی دوست ہوئے اور دوستوں کے لئے قربانی تو کرنا ہی پڑتی ہے ۔ بیٹھو نا ۔ چائے پیو ۔ دیکھنا

ہوں ۔ وہ کمبخت نوکر حجامت کرا کے آیا کہ نہیں ؟"
یہ کہہ کر ایکٹر نے زور کی آواز دی ـــــ "اپے یاسین! ابے او یاسین!"
لمبے بالوں والا ایک دبلا پتلا لڑکا کچن سے آٹا گوندھتا ہوا باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر ایکٹر نے جلدی سے کہا۔
"چائے بناؤ ـــــ!"

گویا فلم انڈسٹری میں کبھی کوئی خالی نہیں ہوتا ۔ اور ہوتا ہے تو صرف اسی وقت ہوتا ہے ۔ جب کوئی کسی سے دام طلب کرتا ہے ۔ اگر پروڈیوسر فنانسر سے پیسے مانگے تو وہ خالی ہاتھ ہوتا ہے ۔ پروڈیوسر سے ایکٹر مانگے تو پروڈیوسر خالی ہوتا ہے ۔ ایکٹر سے گیراج والا مانگے تو وہ خالی ہوتا ہے ۔ ہاتھ خالی جیب خالی ۔ بینک خالی ۔ اس لئے بچو! بجاؤ تالی ۔ اور کہو۔
خ سے خالی!

سوالات

۱ ـــ کڑکی کے دنوں میں چھپے کہاں چلے جاتے ہیں ؟ جواب میں گھپلے بازی سے کام مت لو!

۲ ـــ اگر ایک فلم کے آخر میں ولین کی شادی ہیروئن سے کر دی جائے جیسا کہ زندگی میں اکثر ہوتا ہے ۔ تو اس فلم کے پروڈیوسر کو دیوالیہ ہونے میں کتنے دن لگیں گے ؟ جیوتش لگا کے بتاؤ!

۳ ـ کیا تم نے فلم کے سوائے کسی چھمیا کو فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے دیکھا ہے ؟

اگر دیکھنا ہے تو اپنی عقل کا اور اس چھپیا کی شکل کا بیمہ کراؤ !

۴ ۔ اگر تمہیں ایک دن کے لئے جادو کا ڈنڈا دے دیا جائے تو تم کس کس کو مکھی بناؤ گے ؟

۵ ۔ جھانسی سے جھانسہ کتنی دور ہے ؟ پیدل چل کے بتاؤ — !

دستے دل !

فلم کی دنیا میں دل کی بیماری عام ہے جسے دیکھو دل تھامے ہوئے گھوم رہا ہے ۔ ہیرو ہے کہ دل پر ہات رکھے ایسی ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس کے اندر دل کے بجائے ریفریجیریٹر رکھا ہوا ہے ۔ ہیروئن اپنے دل کا دکھڑا بیان کرتے ہوئے یوں رک رک کر سسکیاں لیتی ہے گویا اس نے پھیپھڑوں میں ہچکیوں کی مشین لگا رکھی ہے ۔ ولین ہے کہ اپنے گول گول دیدے گھما کر دانت پیس کر اپنے چہرے کو انتہائی خوفناک بنا کر کچھ ایسے کربناک لہجے میں اپنے دل کی تکلیف بیان کرتا ہے کہ گمان گزرتا ہے ۔ کہیں اسے دل کے بجائے اپینڈیسائٹز کا دورہ تو نہیں پڑا ؟ — وہ ناچنے والی ہے کہ بھڑک بھڑک کر کہتی ہے ۔ " دل دیکھو ۔ دل دیکھو ۔ دل دیکھو جی " ۔ وہ شاعر ہے کہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتا ہے ۔ " دل بنجارا دیوانہ ' دل کی تمنا تھی مستی میں ' تم کو پیا دل دیا ' دل گیا ساجن کی نگری " ۔ فلم کے نام بھی زیادہ تر دل پر رکھے جاتے ہیں ۔ " دل ہی تو ہے " دل ایک مندر " ایک دل سو افسانے " پھر وہی دل لایا ہوں " فلمی دنیا میں جسے دیکھو دل کی بیماری میں مبتلا ہے مگر مرتا کوئی نہیں !

فلمی دنیا میں سب سے زیادہ مصیبت دل پر ڈھائی جاتی ہے ۔ دل لٹتا ہے ۔ دل روتا ہے ۔ دل زخم کھاتا ہے ۔ دل سے دھوکا کیا جاتا ہے ۔ دل



چرایا جاتا ہے۔ دل پر ڈاکہ پڑتا ہے۔ دل میں ناسور ہوتا ہے۔ دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے رہتے ہیں۔ دل کی کلی کبھی نہیں کھلتی۔ اس کی کوئی آرزو بر نہیں آتی ......

دل نہ ہوا ٹمپریری سکیشن کا کلرک ہوا ——!

مگر مزے کی بات یہ ہے کہ اتنی مصیبتوں کے باوجود دل بول نہیں سکتا۔ فریاد نہیں کر سکتا۔ یہ فلمی دنیا کا قاعدہ ہے۔ دل پر لاکھ چھریاں چلیں۔ مگر دل پولیس میں رپورٹ نہیں کر سکتا۔ دل کو دھوکے پر دھوکے دئے جائیں مگر وہ عدالت میں دعویٰ نہیں کر سکتا۔ دل میں ناسور ہو جائے مگر وہ کسی ڈاکٹر سے رجوع نہیں ہو سکتا۔ اس پہ ڈاکہ پڑ جائے مگر وہ ہمیشہ آچاریہ کبھاوے

کی طرح معاف کرنے پر مجبور ہے۔ عجیب احمق ہے یہ دل۔ مگر فلم کے سنسار میں اس دل کے بغیر گاڑی ایک اِنچ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس لئے اپنے دل پر ہات رکھو اور کہو۔

دسے دل ۔۔۔۔۔۔۔!

دھسے دھانسو !

فلمی ڈکشنری میں اس سے بڑا، اس سے طاقتور، اس سے جاندار اور کوئی کلمۂ تعریف نہیں ہے۔ وہ احمق ہیں جو کسی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور صفحوں کے صفحے کالے کرتے ہیں۔ صرف ایک لفظ سے کام چل سکتا ہے۔ "دھانسو!" ——— فلم بنانے والے کی تعریف کرتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے صرف یہی ایک لفظ کہیئے۔ بس بیڑا پار ہے!

فلم بنانے والا پوچھے۔ "میرا ہیرو کیسا ہے؟"

فوراً جواب دیجئے۔ "دھانسو!"

"میری کہانی کیسی ہے؟"

"دھانسو۔۔۔۔۔!"

"میری فلم کا نام کیسا ہے؟"

"دھانسو ———!"

"میرے ڈائریکٹر کا کام کیسا ہے؟"

"دھانسو ———!"

"میری بغل کا گلفام کیسا ہے؟"

"دھانسو ———!"

"شاباش! کل آ کے کنٹریکٹ کر جاؤ!"

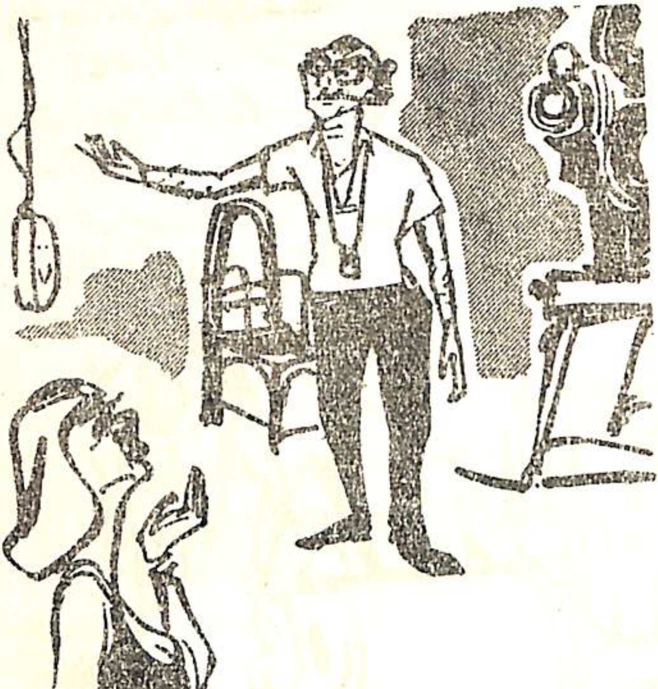
دیکھا آپ نے، یہ ہے لفظ "دھانسو" کا کمال! ویسے دھ سے دھوتی بھی ہے مگر فلم کمپنی میں کسی کی دھوتی نہیں چلتی - دھ سے دھرم بھی ہے - مگر فلم کمپنی میں وہ بھی نہیں چلتا - اس لئے یہ دونوں لفظ بھول جائیے اور صرف یاد رکھیئے -

دھ سے دھانسو!

ڈ سے ڈائریکٹر!

ڈ سے ڈائریکٹر ہوتا ہے بلکہ ہوتا تھا - کیونکہ آجکل ڈائریکٹر کے پاس ہونے کے لئے کچھ رہ نہیں گیا ہے - پرانے زمانے میں ڈائریکٹر فلم کی جان ہوا کرتا تھا - وہ کہانی کا انتخاب کرتا تھا - اس کے مطابق ہیرو اور ہیروئن چنتا تھا - پھر باقی کیریکٹر پھر کہانی کے مزاج کے مطابق سنگیت کار اور شاعر کا انتخاب کرتا تھا اور اسی طرح فلم کے دوسرے شعبوں کو ملا کر ایک ایسی فلم بناتا تھا جو اس کی شخصیت اور فن کی مکمل نمائندگی کر سکتی تھی - اس زمانے میں ڈائریکٹر اپنی تصویر سے پہچانا جاتا تھا - لوگ کہتے تھے - یہ فلم "آدمی" کا ڈائریکٹر ہے - یہ فلم "آن" کا ڈائریکٹر ہے - یہ "سینا" کا ڈائریکٹر ہے —— ! آج کل لوگ کہتے ہیں - یہ دلیپ کمار کا ڈائریکٹر ہے - یہ دیو آنند کا - یہ جانی واکر کا ...... !

پہلے زمانے میں ڈائریکٹر فلم کا خالق ہوتا تھا - آج کل وہ محض لے پالک ہے! اگر ہم اپنی فلموں کو بہتر اور خوبصورت بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی فلموں میں ڈائریکٹر کو اس کا مرکزی مقام دینا پڑے گا اور زور زور سے کہنا پڑے گا —— ڈ سے ڈائریکٹر —— !



ڈھم سے ڈھنڈورا !

اپنے بچپن کی بات کرتا ہوں۔ ہمارے محلے میں ایک ڈھنڈورا پیٹنے والے آیا کرتے تھے۔ نام نتھا سکھانند۔ دُبلے پتلے لانبے آدمی تھے۔ سر پر پٹے رکھتے تھے اور چہرے پر بڑی بڑی خوفناک مونچھیں۔ مگر نہایت شریف آدمی تھے۔ کسی کو دکھ نہ دیتے تھے۔ صرف کبھی کبھی ہمارے محلے میں گلے میں ڈھول ڈالے ہاتھ میں گھنٹی لئے یا ڈگڈگی لئے آتے تھے اور ڈھول بجاکر، ڈگڈگی ہلاکر اپنی

پاٹ دار آواز میں اعلان کرتے تھے۔

آج شام کو —— ساڑھے چھ بجے —— موتی ہال میں ——
سوامی شردھانند کا لیکچر ہوگا —— گیتا کے ساتویں ادھیائے پر ——
ڈگ ڈگ ڈگ !

جب ہم ذرا بڑے ہوئے تو یہی سکھانند اسی ڈھول اور ڈگڈگی کے ساتھ ہمارے محلے میں آکر ڈھنڈورا پیٹنے لگے۔



آج شام کو ——— ساڑھے چھ بجے ——— موتی بال میں ———

مہاتما گاندھی کا لیکچر ہوگا ——— ہندوستان کی آزادی پر ———

ڈگ ڈگ ڈگ !

جب اور بڑے ہوئے۔ تو یہی سکھانند، ڈھول، گھنٹہ، ڈگڈگی لئے آئے اور اسی پاٹ دار آواز میں۔ مگر کسی قدر اداس لہجے میں بولے۔

آج شام کو ——— ساڑھے چھ بجے ——— موتی سینما میں ———

مس مادھوری اور ای بلوموریا کا لیکچر ہوگا ——— نام ہے ——— پریم کا ڈنڈا ——— ! ڈگ ڈگ ڈگ !

اس کے بعد انہوں نے سر جھکا کر ہتھیلی برابر چھوٹے چھوٹے کاغذ بانٹنا شروع کردئے جس پر اسی لیکچر کی مزید تعریف لکھی ہوئی تھی۔ میں نے پہلی بار دیکھا کہ ان کا چہرہ کچھ مرجھا گیا ہے جیسے وہ یک لخت بڈھے ہوگئے ہوں!

پھر ایک دن میں نے دیکھا کہ ہمارے محلّے کی دیوار پر، دکانوں پر اور ہر خالی جگہ پر بڑے بڑے رنگین کاغذ لگے ہوئے ہیں۔ جن پر ایک خوبصورت عورت کی تصویر ہے جو اپنے کپڑوں کے باوجود تقریباً ننگی نظر آرہی ہے اور محلے کے بچے جوان بوڑھے ان رنگین کاغذوں کے گرد اکٹھے ہوکر بڑی حیرت سے ان تصویروں کو دیکھ رہے ہیں جس کے نیچے لکھا تھا۔

ہندوستان کا سب سے شاندار فلم

آپ کے شہر کے سب سے شاندار سینما میں

فلمی دنیا کی سب سے شاندار جوڑی کے ساتھ

ڈی فنوز اور مس ہچکولا

پریم کے پھندے !

سارے دھندے چھوڑ کر دیکھئے "پریم کے پھندے"! موتی سینما میں۔ ہر روز پانچ شو ہوں گے (جن میں تین تو میٹنی ہوں گے۔ پہلا میٹنی آٹھ سے گیارہ بجے صبح۔ دوسرا میٹنی بارہ بجے سے تین بجے دوپہر تک۔ تیسرا میٹنی سوا تین سے سوا چھ بجے تک۔ پھر ساڑھے چھ سے ساڑھے نو تک۔ پھر آخری شو ساڑھے نو سے ساڑھے بارہ بجے رات تک ہوگا)۔

ایڈوانس ٹکنگ جاری ہے!

میں جب یہ اشتہار پڑھ کر پیچھے ہٹا۔ تو مجھے سکھا نند نظر آئے۔ چھاتی پر ڈھول لٹکائے اور ہاتھ میں گھنٹہ لئے خاموش کھڑے نظر آئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آج انہوں نے محلے میں نہ گھنٹہ بجایا نہ ڈھول۔ چپ چاپ اپنے آنسو پیتے ہوئے خاموشی سے سر جھکا کے واپس چلے گئے۔

اس دن کے بعد میں نے سکھا نند کو ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

وہ ڈھنڈورا پیٹنے والے چلے گئے جو صرف مطلب کی بات بتاتے تھے اور بات کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ ناظرین پر چھوڑ دیتے تھے۔ اب نئے ڈھنڈورچی آئے ہیں۔ ڈھنڈورا یہ بھی پیٹتے ہیں۔ نام ان کا بھی سکھا نند ہے۔ مگر ان کے گلے میں نہ ڈھول ہے نہ ہاتھ میں گھنٹہ ہے۔ نہ بغل میں ڈگڈگی ہے! آجکل کے ڈھنڈورا پیٹنے والوں کے ہاتھ میں قلم ہوتے ہیں۔ بغل میں وہسکی، کاغذ پر جھوٹ!.........! اس لئے بچو! اگر فلم میں زندہ رہنا چاہتے ہو۔ تو ہمیشہ اپنا یا کسی دوسرے کا ڈھنڈورا پیٹو اور کہو۔

ڈھ سے ڈھنڈورا!

ذ سے ذلّت !

کوٹھے پر ناچنے والی ذلیل سمجھی جاتی ہے۔ فلم میں ناچنے والی ذلیل نہیں سمجھی جاتی۔ کوٹھے پر گانے والی بُری سمجھی جاتی ہے۔ فلم میں گانے والی عزت پاتی ہے۔

پرائیویٹ محفلوں میں جنس کا مظاہرہ کرنے والی اوباش مانی جاتی ہے۔

فلم میں جنس کا عریاں اظہار کرنے والی اداکارہ کہلاتی ہے۔

زندگی کے دوسرے شعبوں میں میرے یا آپ جیسا انسان کئی بار ذلّت محسوس کرتا ہے۔ اگر کوئی مجھے گالیاں دے تو ذلت کا احساس ہوگا۔ میں کسی سے وعدہ کر کے



مکر جاؤں۔ تو لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے! کسی سے قرضہ لے کر پھر جاؤں یا لوگوں کے لاکھوں لے کے دیوالیہ ہو جاؤں تو لوگ مجھے ذلیل سمجھیں گے مگر فلمی دنیا میں یہ سب کچھ شب و روز ہوتا رہتا ہے۔ پھر بھی کوئی ذلیل نہیں ہوتا۔ کیونکہ فلم انڈسٹری میں سب کچھ ہوتا ہے۔ صرف ذلّت کا لفظ ہی نہیں ہوتا!

مگر میں نے غلط کہا۔ فلمی دنیا میں بھی ذلّت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کوئی ایسی تصویر بنائیں جو صاف ستھری اور با مقصد ہو۔ جس میں انسان کی بڑائی، زندگی کی اچھائی اور کائنات کی دلربائی کے عناصر کا اظہار ہو تو آپ انتہائی ذلیل و خوار ہوں گے۔ اخبار والے آپ کے خلاف لکھیں گے کیونکہ وہ ہر اچھے مقصد کو پراپیگنڈا سمجھتے ہیں۔ آپ کی فلم خریدنے والا اسے کسی تھرڈ کلاس پکچر ہاؤس میں چلائے گا۔ کیونکہ آپ نے بڑے بڑے ستارے نہیں لئے۔ پبلک آپ کی تصویر کو رد کر دیگی۔ کیونکہ آپ نے وہ سیکس اور گلیمر نہیں دیا جس کی وہ عادی ہو چکی ہے!

آپ اپنی ساری پونجی کھو دینگے اور دونوں خالی جیبیں جھاڑتے ہوئے یہ کہتے ہوئے فلم انڈسٹری سے باہر نکل جائیں گے ؎

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اس لئے اگر ذلّت سے بچنا چاہتے ہو تو ہر طرح کی ذلّت کے لئے تیار رہو اور کہو۔

ذ سے ذلّت!

ر سے رومانس!

رومانس ہر فلم میں ہوتا ہے اور جس فلم میں رومانس نہیں ہوتا اُسے ہم

ڈوکیومینٹری کہتے ہیں! ڈوکیومینٹری میں عام طور پر لیڈروں کے بھیانک چہرے ہوتے ہیں اور ان کی لمبی لمبی تقریریں یا ان میں مچھر مارنے سے لے کر پرانایام کرنے تک کے طریقے بتائے جاتے ہیں اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ڈوکیومینٹری میں کسی طرح کی کوئی دلچسپی نہ آنے پائے۔ عام طور پر لوگ ڈوکیومینٹری کو آنکھ بند کرکے دیکھتے ہیں کہ ڈوکیومینٹری دیکھنے کا یہی سب سے اچھا طریقہ ہے!

مگر رومانس کی بات اور ہے۔ رومانس آتے ہی تماشائیوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ دل بھی کھلنے لگتا ہے۔ فلم دیکھنے والی ہر لڑکی دل ہی دل میں اسکرین پر نظر آنے



والے ہیرو کو چاہنے لگتی ہے اور فلم دیکھنے والے مرد ہیروئن کی ہر ادا پر لوٹ لوٹ جاتے ہیں جس فلم میں جتنی زیادہ کامیابی سے یہ عمل ہوتا ہے وہ فلم اتنی ہی کامیاب ہوتی ہے!

رومانس کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک لڑکا ہو خوبصورت، ایک لڑکی ہو، اور وہ بھی خوبصورت ہو۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کا خوبصورت ہونا بہت ضروری ہے۔ زندگی میں بدصورت لڑکے لڑکیاں بھی رومانس کرتے ہوں گے۔ مگر فلم میں نہیں کرتے!

فلمی رومانس تین طرح کا ہوتا ہے:-

۱ — پنجابی رومانس :— اس رومانس میں لڑکا لڑکی دونوں زیادہ تر اپنے ہاتوں کا استعمال کرتے ہیں۔ لڑکا لڑکی کو دیکھ کر گھورتا ہے۔ پھر اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹتا ہے (اگر زیادہ رومانس دکھانا منظور ہو۔ تو لڑکی کو چٹیا سے پکڑ کر اپنے قریب لاتا ہے) ...... لڑکی غصے میں آکر لڑکے کے منہ پر طمانچہ مارتی ہے۔ لڑکا زور سے اس کی پیٹھ میں گھونسہ مارتا ہے۔ لڑکی چپل نکال لیتی ہے۔ دونوں لڑتے لڑتے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں اور رومانس ہو جاتا ہے!

۲ — بنگالی رومانس :— اس میں ہاتوں کے بجائے آنکھوں سے کام لیا جاتا ہے اس رومانس میں خاص بات یہ ہے کہ نہ لڑکا پوری تصویر کے دوران لڑکی کو چھوتا ہے، نہ لڑکی لڑکے کو چھوتی ہے۔ بس دونوں قریب یا نزدیک سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں اور دھیرے دھیرے روتے رہتے ہیں!

۳ — بمبیا رومانس :— اس میں ہاتوں اور آنکھوں کے بجائے ٹانگوں سے کام

لیا جاتا ہے۔ چست جینز پہن کر جاز کی دھن پر کولہے مٹکائے جاتے ہیں۔ جو
جتنا زیادہ سے زیادہ دیر تک کولہے مٹکا سکے وہ سمجھو رومانس کا جوڑا ہے۔
فلمی رومانس میں یہ ضروری ہے کہ اگر لڑکا امیر ہے تو لڑکی غریب ہو۔
لڑکا غریب ہے تو لڑکی امیر ہو۔ امیر کا امیر سے اور غریب کا غریب سے رومانس
کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دراصل فلم والے اس طریقے سے امیر اور غریب میں
ملاپ کرانا چاہتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اگر فلم والوں کے کہنے میں آکر چند
ہزار امیر لڑکے غریب لڑکیوں سے شادی کر بھی لیں تو باقی کروڑوں غریب لڑکے
لڑکیوں کا کیا ہوگا؟

جب تک اس مسئلے کا کوئی حل دریافت ہوتا ہے آپ بھی فلمی رومانس
کیجیئے اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہیئے۔

ڑ سے رومانس!

ڑ سے جھگڑا!

ویسے تو "ڑ" سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا ـــــ "ڑ" کا حرف ہمیشہ کسی لفظ
کے بیچ میں پایا جاتا ہے ـــــ جیسے جھگڑا ـــــ جیسے بمبئیا زبان میں لفڑا کہتے
ہیں۔ (دونوں لفظوں میں "ڑ" موجود ہے)۔

"ڑ" جھگڑے کے بیچ میں موجود ہے! اور جھگڑا بھی کسی دو افراد کے بیچ میں
ہوتا ہے۔ بھلا کوئی اکیلا کس سے جھگڑے گا؟

جھگڑنے کے لئے دو یا دو سے زیادہ افراد کا ہونا ضروری ہے!

فلم میں بھی جھگڑا ہوتا ہے۔ مار پیٹائی ہوتی ہے۔ گھونسہ بازی ہوتی ہے
مگر اس سے کسی کو چوٹ نہیں پہنچتی۔ خون نہیں نکلتا۔ صرف لال روشنائی



بہتی ہے ۔ اور گھونسہ چہرہ سے ایک اِنچ دور رہتا ہے اور پستول بھی اگر چلتا ہے تو
اس میں کارتوس کے بجائے پٹاخہ ہوتا ہے ۔ یہ فلمی جھگڑا جو فلم میں اس قدر خوفناک
دکھائی دیتا ہے ۔ اصل میں بہت ہی معصوم اور بھولا بھالا سا ہوتا ہے ۔ اس لئے
بڑے مزے اور اطمینان سے اس جھگڑے کو دیکھو ۔ اور کہو ۔

ڑسے جھگڑا !

زرسے زندگی!

ہماری زندگی جیسی کہ آجکل چلتی ہے یا چلائی جاتی ہے۔ اس زندگی سے بہت مختلف ہے جو فلم میں دیکھی یا دکھائی جاتی ہے۔ فلم میں ایک مزدور لڑکی بھی ڈھائی سو (۲۵۰) کی ساڑھی پہنے ڈیڑھ سو کا میک اپ کئے ناچتی نظر آتی ہے حقیقت میں اسے زندگی بھر کبھی پچاس کی ساڑھی نصیب نہیں ہوتی۔ فلم میں ایک مڈل کلاس گھر کا جو ڈرائنگ روم پیش کیا جاتا ہے۔ اسے اگر ایک مڈل کلاس آدمی خریدنا چاہے تو اس کی دو برس کی آمدنی صرف ہو جائے! فلم میں جس طرح ایک ہیرو پچاس آدمیوں کو مار بھگاتا ہے۔ اسی ٹیکنک پر عمل کرتے ہوئے میں نے بھی ایک دفعہ اپنے دشمنوں کو مار بھگانے کی کوشش کی۔ نتیجے میں میری وہ پٹائی ہوئی کہ دونوں بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ اور تین مہینے اسپتال میں رہنا پڑا۔

اسی طرح ایک بار میں نے فلم دیکھی تھی جس میں ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات بس کے اڈے پر ہوتی ہے۔ ہیرو پہلے سے بس کے اڈے پر کھڑا ہے۔ اتنے میں ایک نہایت خوبصورت لڑکی آتی ہے اور کیو میں ہیرو کے بعد آ کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں بارش ہونے لگتی ہے۔ ہیرو فوراً چھاتا کھول کر ہیروئن کے سر پر رکھتا ہے۔ ہیروئن مسکرا کر ہیرو کے چھاتے میں آجاتی ہے اور بس۔ محبت ہو جاتی ہے!

مجھے یہ منظر اس قدر پسند آیا کہ اسے دیکھنے کے بعد میں مہینوں چھاتہ لے کر بس کے اڈوں میں گھومتا رہا۔ مگر اول تو مجھے کوئی خوبصورت لڑکی نظر نہیں آئی اور کبھی نظر بھی آئی تو اس کے پاس خود ایک چھاتہ تھا۔ یا شوہر تھا۔ اور اگر دونوں میں سے کچھ نہ تھا تو کمبخت بارش ہی نہ ہوتی!

مگر ایک بار قسمت نے یاوری کی۔ اس دن بس اسٹاپ بھی تھا۔ میں بھی

تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی اور بارش بھی آگئی۔ ہیرو بے حد خوش ہوا۔ فوراً چھاتہ لے کر خوبصورت لڑکی کی طرف مسکراتا ہوا بڑھا۔ لڑکی نے شرما کر چھاتہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جاری سے دوڑ کر چلتی بس میں سوار ہو گئی۔

لیجئے۔ چھاتہ بھی گیا۔ لڑکی بھی گئی اور میں بارش میں بھیگتا کھڑا رہ گیا۔

زندگی اور ہے۔ فلم اور ہے۔ جس طرح ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں! ہمارے عہد میں، ہمارے ملک میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو فلم میں اصلی زندگی نہیں دیکھنا چاہتے۔ کیونکہ وہ بہت بھیانک ہے۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں چند جھوٹے سُہانے سپنے۔ چند خوبصورت فریب، چمکتے ہوئے دھوکے جو ان کو چند لمحوں کے لئے تسلی دے سکیں! اس کے بعد——— وہ جانتے ہیں پھر وہی زندگی ہوگی وہی اس کی تلخیاں اور مجبوریاں ہونگی اور وہی زندگی، زیاں سے معمور......!

زہے زندگی!

زہے ژال (نام پہلوان کا)

ژال نام پہلوان کا ہوتا ہے۔ آپ پوچھیں گے پہلوانوں کا فلم سے کیا تعلق؟

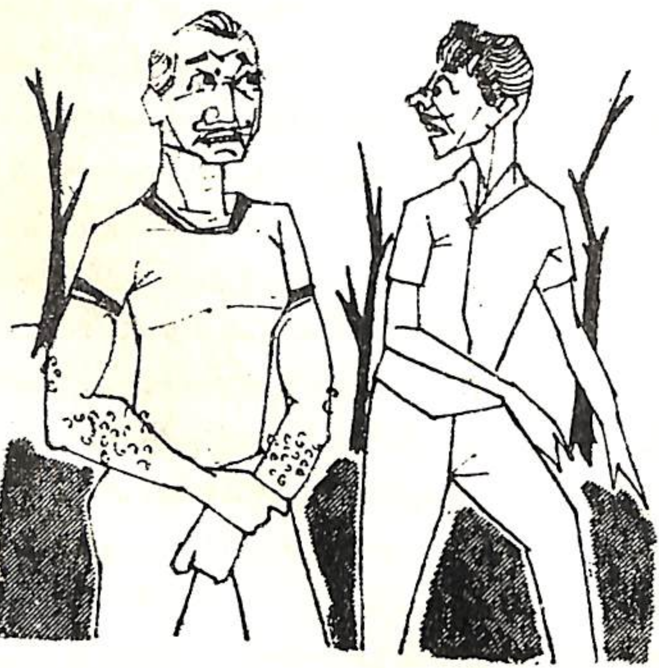
کچھ عرصہ پہلے واقعی کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا تھا کہ کسی فلم کے کسی حصے میں دو پہلوانوں کی کُشتی دکھا دی جاتی تھی——— مگر اب تو فلم انڈسٹری میں چاروں طرف پہلوان ہی پہلوان نظر آتے ہیں!

پہلے فلم والے خوبصورت چہروں اور چاکلیٹ ٹائپ کے ہیرو کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ آجکل وہ پہلوانوں کو ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ آج کل

جوق در جوق ہندوستان کے مختلف گوشوں سے پہلوان آکر فلم انڈسٹری میں ہیرو بن رہے ہیں کشتیاں لڑکر جتنا وہ ساری زندگی میں کما سکتے تھے۔ آجکل وہ صرف ایک فلم سے کما لیتے ہیں!

پہلے فلم انڈسٹری میں صرف خوبصورت اور دیدۂ زیب نوجوانوں کی کھپت تھی۔ اب اگر آپ بدصورت ہیں۔ آواز بُری پائی ہے۔ ایکٹنگ، نہیں کرسکتے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ کا پہلوان ہونا کافی ہے!

عام طور پر نئے چہروں کو فلم کے دوران بہت ڈانٹا جاتا ہے کیونکہ بیچارے ناتجربہ کار ہوتے ہیں۔ لیکن ناتجربے کار سے ناتجربے کار پہلوان کو بھی کوئی نہیں ڈانٹ،



سکتا۔ میں ایک دوست پنجابی پہلوان کو جانتا ہوں۔ جسے فلم کے دوران مندرجہ ذیل مکالمہ یاد کرنے کے لئے دیا گیا:-

"کیا کہا؟ شہزادہ۔ شہزادی کو لے کر بھاگ گیا؟"

پہلوان نے اچھی طرح سے یاد کر کے اس مکالمے کو رٹ لیا۔ جب رٹ لیا۔ تو اس نے ڈائریکٹر سے کہا: "کیمرہ چلاؤ!"

جب کیمرہ چلنے لگا تو ڈائریکٹر نے پہلوان کو بولنے کا اشارہ کیا۔ پہلے تو پہلوان نے اپنے سینہ کو پھُلایا۔ پھر اپنے دونوں بازوؤں کی مچھلیاں گھمائیں۔ پھر گرج کر بولا۔

"کی کہیا؟ شجادا ــــــ شجادی نُوں لے کے بھگ گیا؟"

"کٹ!" ڈائریکٹر زور سے چلّایا۔

پہلوان نے گھُور کر ڈائریکٹر کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھوں کی مُٹھیاں بند کیں۔ اور دھیرے دھیرے ڈائریکٹر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"کی کہیا؛ گلط ہے؟"

"جی نہیں!" ڈائریکٹر کانپ کر بولا۔ "شاٹ اکدم اوکے (OKEY) ہے!"

آج کل پہلوانوں کی چاندی ہے۔ ڈائریکٹر سیٹ پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پروڈیوسر پیسہ نہیں روک سکتا۔ انکم ٹیکس کا انسپکٹر تک قریب آتے ہوئے ڈرتا ہے۔

اس لئے اگر آپ پہلوان ہیں تو فوراً لنگوٹ باندھ کر فلم کے میدان میں اُتر آئیے اور ران پر ہاتھ مار کر للکار دیجئے ــــــ تُرے تڑال ــــــ نام پہلوان کا!

ٹس سے سینما!

اگر آپ کی محبوبہ آپ سے کہے۔ میں ساڑھے پانچ بجے فلاں جگہ پر آپ سے

ملوں گی تو اس جگہ پر ضرور کوئی سینما ہال ہوگا !

اگر وہ کہے - مجھے گھر سے آکے لے جانا اور دو ٹکٹ بھی ساتھ لیتے آنا -
تو سمجھ لیجئے کہ اس نے سینما کے دو ٹکٹ منگوائے ہیں ـــــ میں ایک دفعہ
غلطی سے ریلوے پلیٹ فارم کے دو ٹکٹ لیتا گیا تھا - بڑا گھپلا ہوا -

اگر کسی ہال کے باہر جگمگاتی روشنیوں اور ادھ ننگی عورتوں کے پوسٹر کے نیچے
تنگ موہری کی پتلون پہنے ہوئے لڑکے اور بے حد سجی ہوئی لڑکیاں سر پہ بالوں
کو ٹوکری کی طرح اوپر اٹھائے ہوئے نظر آئیں - فوراً سمجھ جائیے کہ یہ ایک سینما
ہال ہے !

سینما ہال میں بیک وقت دو فلمیں دکھائی جاتی ہیں - ایک فلم پردے
پر چلتی ہے - دوسری ہال کی سیٹوں پر چلتی رہتی ہے - دونوں فلموں کے لئے
اندھیرا اشد ضروری ہے !

سَ سے سلور جوبلی ہے - جب کوئی فلم ایک ہی سینما میں متواتر پچیس
ہفتے چلتی رہتی ہے - تو سلور جوبلی مناتی ہے - یعنی چاندی کی جوبلی......
ایسے موقع پر جوبلی تو فلم دیکھنے والوں کو ملتی ہے اور چاندی فلم دکھانے
والوں کے ہاتھ آتی ہے -

سَ سے اسٹوڈیو بھی ہے - جہاں فلمیں بنائی جاتی ہیں -- فلم بنانے کا
آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی سینما سے کوئی امریکی تصویر دیکھ آئیے اور اسٹوڈیو
میں آکر اسے بگاڑنا شروع کر دیجئے - بگاڑتے بگاڑتے ہندوستانی فلم بن
جائے گی !

سَ سے اسکول بھی ہے ، جہاں کسی زمانے میں لڑکے پڑھنے کے لئے
جاتے تھے - آجکل وہ سینما جاتے ہیں اور اسکول میں بیٹھے بیٹھے استاد خالی

پنچوں سے نکسیاں اڑاتے ہیں!

اگر آپ کا لڑکا بھاگ گیا ہے تو اس کے لئے پولیس اسٹیشن جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ فوراً ٹکٹ کٹا کر بمبئی آجایئے۔ آپ کا لڑکا آپ کو ضرور کسی اسٹوڈیو کے اندر یا باہر چکر لگاتا ہوا مل جائے گا!

اس کے بعد آپ اپنے دونوں کان پکڑیئے اور کہیئے۔

س سے سینما!

ش سے شاعر!

فلمی شاعر ادبی شاعر سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ادبی شاعر گیت کہتا ہے۔ فلمی شاعر گیت لکھتا ہے۔ بلکہ اکثر ٹھوکتا ہے۔ جس طرح لوگ دیوار پر کیل ٹھوکتے ہیں۔

شاعر بھائی ایسا گیت ٹھوکو۔ ایسا گیت ٹھوکو کہ سارا لوگ، سنگم بھی بھول جائیں۔ (فلمی ڈائریکٹر کا تقاضہ)۔

ادبی شاعر کہتا ہے۔ فلمی شاعر سنگر لکھتا ہے۔ جس کی سطریں موسیقار (میوزک ڈائریکٹر) کی مرضی کے مطابق چھوٹی بڑی کر دی جاتی ہیں۔ شاعر نے گیت کی سطریں یوں لکھیں۔ "وہ پنگھٹ پر آئے"۔ اب موسیقار نے گنگنانا شروع کیا۔

"وہ پن گھٹ پر آئے، وہ پن گھٹ پر آئے ہائے"۔ "دیکھئے لفظ ہائے اس دھن میں کیا فٹ بیٹھا ہے!" ڈائریکٹر نے کہا۔

"تو لگا دو ناجی ہائے"، اس کے ساتھ ہی ساعر بھائی!

اور ساعر بھائی نے دست بستہ عرض کیا۔ "بجا ارشاد"۔ "وہ پنگھٹ

پر آئے ہائے ہائے" ——— "لفظ ہائے اگر تین دفعہ آجائے تو لطف دوبالا ہو جائے دوبالا!" میوزک ڈائریکٹر نے کہا — !

ڈائریکٹر بولا ——— "شاعر بھائی اس کو جلدی سے میوزک ڈائریکٹر کی مانگ دبلا (دوبالا) بناؤ ——— !"

اب گیت کی سطریں یوں ہو گئیں :-

"وہ ہنگمٹ پر آئے ہائے ہائے ہائے!"

موسیقار نے پھر گنگنانا شروع کیا۔ "وہ ہنگمٹ پر آئے" ہائے ہائے ہائے"۔ ہارمونیم لے کر بیٹھے اور ڈائریکٹر سے اُس دُھن کے بارے میں پوچھا "کیسی رہی دُھن؟"



ڈائریکٹر نے کہا۔ "سالی دھن جمتی نہیں!"

اس فلمی دنیا میں ڈائریکٹر کو کوئی چیز نہیں جمتی۔ نہ پکچر نہ ڈانس۔ نہ گانا نہ مکالمے ــــــ سالا کچھ جمتا نہیں ــــــ یہ گانا۔ اس میں دھم نہیں۔ جب تک پکچر ہاؤس میں پاؤں سے کھٹا کھٹ تال نہ دیں۔ یہ گانا بنڈل رہیگا۔ سمجھے غلام صابر!

ماسٹر غلام صابر نے پھر گنگنانا شروع کیا۔

" وہ پنگھسٹ

وہ پنگھٹ

شاعر نے لقمہ دیا۔ "وہ نٹ کھٹ، وہ نٹ کھٹ!"

ڈائریکٹر نے اصلاح دی۔ "وہ جھٹ پٹ، وہ جھٹ پٹ!"

وہ نٹ کھٹ جھٹ پٹ پنگھٹ پر آئے۔

"ہائے ہائے" شاعر نے اچھل کر کہا۔ "گیت ہوگیا۔ ہوگیا۔ ہوگیا ــــ!"

ڈائریکٹر نے شاعر کو گلے لگا کر کہا۔ "ہاں ہوگیا۔ تو بڑا سالا ساعر ہے۔ تو مہاکوی تلسی داس ہے۔ مہاکوی کالی داس ہے۔ مہاکوی مدھوک۔ مہاکوی ہردیپ اور مہاکوی مہامہو پادھیائے ہے"........ جنھوں نے "چور بازار اور چنڈو باز" کے گانے لکھے ہیں۔ تو ان سے بھی بڑھ کر ہے اور نو جوش (جوش) اور مجاج (مجاز) کا بھی باپ ہے۔ وہ تیرے اوپر کیا گانا لکھیں گے ــــ یہ پوری اور پانی پوری کھانے بجار (بازار) سے!

شاعر اُردو کا ہو تو شاعر اعظم کہلاتا ہے۔ ہندی کا ہو تو مہاکوی ــــ لیکن مہاکوی ہو یا شاعر اعظم دونوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔ چاہے وہ دوہا ہو۔ گیت

ہو۔غزل ہو یا قوالی ۔ فلمی گیت میں اگر چاند ۔ پپیہا ۔ ندیا ۔ برہا ۔ جیا ۔ تڑپائے ۔ جل جائے ۔ اگنی ۔ طوفان ۔ منجدھار ۔ بیقرار کا ذکر ہزار بار نہ ہو تو وہ فلمی گیت کبھی پاس نہیں ہوتا ۔ بنڈل ہو جاتا ہے ۔ ادبی شاعر کے گیت سمجھے جاتے ہیں ۔ فلمی شاعر کے گیت تو نہیں البتہ ان کی دُھنیں ضرور سمجھی جاتی ہیں اور اسی لئے وہ لکھے جاتے ہیں ۔ معنی اور مطلب سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ گیت جتنا مہمل ہوگا ۔ موسیقار اس کی دُھن اتنی ہی زیادہ اچھی بنائے گا ۔ اس لئے فلمی شاعر وہی کامیاب ہو سکتا ہے ۔ جو صرف ڈڈاں ۔ ڈڈاں ۔ ڈاں پر قناعت کرے ۔

فلمی گیتوں کی اصلاح کا خیال دل سے نکال دیجئے ۔ نہیں تو خود اسٹوڈیو سے کبوترے جو اڑ کر نکل جائیے !

ادبی شاعر کی طرح فلمی شاعر بھی تخلّص رکھتا ہے ۔ جیسے آہ ۔ واہ ۔ ہا ہا اور اگر ہنسی نے زیادہ زور پکڑا ہو تو ہا ہا ہا ۔ اس کے علاوہ آج کل ٹیکنی کلر فلم کی مناسبت سے شاعروں نے اپنے تخلّص میں مختلف رنگوں کا استعمال بھی شروع کر دیا ہے ۔ جیسے نارنجی ۔ اودا انگری ۔ بابا عالم سیاہ پوش محمد احمد سبزواری ۔ پیلا پیلا ۔ سُرخ بھینی ۔ سرخا سرخا پیلی بھینی وغیرہ وغیرہ ۔

ص سے صندوق !

گھروں میں جو صندوق ہوتے ہیں ان میں اکثر کپڑے پڑے رہتے ہیں ۔ فلم میں جو صندوق ہوتے ہیں ان میں فلم کے ڈبے پڑے رہتے ہیں یا میک اپ کا سامان پڑا رہتا ہے !

فلم میں ایک صندوق جادو کا صندوق ہوتا ہے ۔ جسے کھولتے ہی اس

میں سے جادو کا جِن نکلتا ہے یا کوئی خوبصورت لڑکی نکلتی ہے یا کالا ناگ نکلتا ہے !

مگر فلمی دنیا میں سب سے قیمتی صندوق فلم فنانسر کا ہوتا ہے ! فنانسر انگریزی زبان کا لفظ ہے۔ مگر فلم والوں نے فلم کے ساتھ ساتھ فنانسر کے لفظ کو بھی اپنی ڈکشنری میں داخل کر لیا ہے۔ صرف معنی بدل گئے ہیں !

انگریزی زبان میں فنانسر اس آدمی کو کہتے ہیں جو پیسہ لگاتا ہے۔ ہمارے ہاں فنانسر اس آدمی کو کہتے ہیں جو پیسہ نہیں لگاتا ہے۔

آپ پوچھیں گے۔ یہ کیسے ممکن ہے ؟ پیسہ لگائے بغیر آدمی فلم کا فنانسر کیسے بن سکتا ہے ؟

معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے اور مشکل سے سمجھ میں آتا ہے مگر میں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ معاملہ حساب کا ہے۔ ذرا غور سے سنو بچّو !

فرض کر لیجئے کہ آپ کے پاس وہ جادو کا صندوق ہے جس میں کالے یا سفید بازار کے نوٹ بھرے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ کے صندوق میں نوٹ بھرے ہوئے ہوں۔ اگر بازار میں اس کی شہرت ہے کہ آپ نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق رکھتے ہیں (چاہے اندر سے وہ صندوق خالی ہی کیوں نہ ہو) بس۔ فلم فنانسر بننے کے لئے یہی شہرت کافی ہے۔

اگر بازار میں آپ کا نام ہے۔ اگر لوگ جانتے ہیں کہ آپ لکھ پتی ہیں۔ تو آپ فوراً فلم فنانسر بن سکتے ہیں اور کسی پروڈیوسر سے "لکھت پڑھت" کر کے کسی فلم کے تمام ارضی وسماوی حقوق خرید سکتے ہیں۔ ایسے حقوق خریدنے والے کو فلمی اصطلاح میں "ورلڈ رائٹ کنٹرولر" کہا جاتا ہے۔

جونہی آپ کنٹرولر بن گئے۔ فلم پروڈیوسر اخباروں میں اپنی فلم کا

اشتہار دیتا ہے اور آخر میں آپ کا نام بطور ورلڈ رائٹ کنٹرولر دیتا ہے۔
اس اشتہار کو دیکھتے ہی پروڈیوسر کے پاس دھڑا دھڑ بڑے بڑے ڈسٹری بیوٹر یعنی فلم تقسیم کرنے والوں کے آفر آنے لگتے ہیں۔ وہ لوگ فلم کے بڑے سنالے اور فلم کے بڑے فنانسر کا بڑا نام دیکھ کر پروڈیوسر کو ایڈوانس چیک بھی دے جاتے ہیں اور فلم اپنے لئے ریزرو کرا جاتے ہیں۔ مگر یہ روپیہ ایڈوانس کا پروڈیوسر کی جیب میں نہیں جاتا ہے۔ فنانسر کے صندوق میں جاتا ہے۔
فرض کر لیجئے کہ ایڈوانس میں دو لاکھ روپیہ آیا۔ اب فنانسر یہ دو لاکھ روپیہ (جو اس نے نہیں لگایا) قرض پر پروڈیوسر کو دیتا ہے۔ قرضے کی شرائط بہت آسان ہیں۔
دو لاکھ پر نو فی صدی سود (کہ اس سے زیادہ گورنمنٹ کی اجازت نہیں ہے)۔
دو لاکھ پر رائیلٹی بارہ فی صدی کے حساب سے۔
دو لاکھ پر دو فی صدی دلال کا کمیشن (دلال بھی فنانسر خود ہوتا ہے)
دو لاکھ پر اوور ایڈنگ کمیشن۔ دو فی صدی!
یہ کل ملا کے پچیس فی صدی ہوا۔ یعنی دو لاکھ میں سے پچاس ہزار کاٹ کے وہ خود اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور بقیہ ڈیڑھ لاکھ وہ فلم پروڈیوسر کے حوالے کرتا ہے جس سے فلم بننا شروع ہو جاتی ہے۔ بیچ میں اگر فلم رک جاتی ہے تو فنانسر بڑی خوش دلی سے وہ پچاس ہزار بھی جو اس نے پہلے کاٹ لیا تھا۔ اب بطور قرض پروڈیوسر کے حوالے کرتا ہے۔ اسی پچیس فی صدی سود پر جس کا حساب میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔
اس کے علاوہ اور بھی شرائط ہوتی ہیں۔ پروڈیوسر اور فنانسر کے درمیان

بالعموم فنانسر منافع میں سے پچاس فی صدی کا حقدار ہوتا ہے - یہ ہو گیا پچھتر فی صدی - پھر اوور فلو (OVER FLOW) میں سے بھی وہ خاصی رقم پیٹ لیتا ہے - کل ملا کے جب پروڈیوسر آخر میں حساب کرتا ہے تو اُسے معلوم ہوتا ہے کہ منافع تو فنانسر کے صندوق میں گیا - اور اس کے حصّے میں گھاٹا آیا ہے - سات لاکھ کا ....!

تب وہ سر کھجلا کر بڑی حسرت سے فنانسر کے صندوق کی طرف دیکھتا ہے اور کہتا ہے -

حن سے صندوق !

حن سے صندر !

پروڈیوسر پہلی فلم تو منافع کے لئے بناتا ہے - دوسری فلم پہلی کا گھاٹا اتارنے کے لئے - تیسری - پہلی دونوں فلموں کا قرضہ اُتارنے کے لئے - اور اس طرح وہ ضد میں ایک کے بعد دوسری فلم بنائے چلا جاتا ہے - حتیٰ کہ اس پر پچیس تیس لاکھ کا قرضہ ہو جاتا ہے .... تب وہ دیوالیہ ہو جاتا ہے اور کپڑے جھاڑ کر فلم لائن سے الگ ہو جاتا ہے -

سبھی فنانسر برے نہیں ہوتے - سبھی پروڈیوسر گھاٹے میں نہیں رہتے مگر کامیابی اور ناکامیابی کی شرح ایک اور چار کی ہے - ایک فلم کامیاب ہوتی ہے تو چار نہیں - ایک آدمی لکھ پتی ہوتا ہے تو چار لکھ پتی دیوالیہ ہوتے ہیں !

میں تو کہتا ہوں کہ فلم میں کام کرنے والے لوگ بڑے بہادر اور جیالے ہوتے ہیں - جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی ضد میں آ کر فلمیں بناتے چلے جا

رہتے ہیں۔

ض سے ضد !

ط سے طمانچہ !

فلم چلانے کے لئے طمانچے کی اکثر ضرورت پڑتی ہے۔ جب فلم چلتے چلتے بور کرنے لگتی ہے۔ تماشائی اکتانے لگتے ہیں۔ یا اونگھنے لگتے ہیں۔ اس وقت ہیرو ولین کے یا ولین ہیرو کے یا ہیروئن ہیرو کے تڑ سے طمانچہ مار دیتی ہے۔ اور کہانی آگے چلنے لگتی ہے۔ طمانچہ اتنے زور کا ہوتا ہے کہ اونگھنے والے تماشائی بھی جاگ جائیں!

خاص کر گھریلو فلموں میں طمانچہ بہت کام میں آتا ہے۔ فرض کر لیجئے۔ گھر کے سب لوگ بیٹھتے ہیں۔ بھائی۔ بہن۔ ساس دلہن۔ باپ۔ ہیرو —— میٹھی میٹھی باتیں ہو رہی ہیں۔ تماشائی جمائی لینے لگتے ہیں کیونکہ اس سین میں کیا مزا ہے۔ بس تڑ سے ایک طمانچہ ساس دلہن کے یا دلہن ساس کے مار دیتی ہے۔ اور کہانی آگے چلنے لگتی ہے۔ آگے جا کے جب پھر کہانی رُکنے لگتی ہے تو ہیرو اپنے باپ کو طمانچہ مار دیتا ہے اور کہانی پھر آگے چلنے لگتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ فیملی پکچر کی کہانی طمانچے کے سہارے ہی چلتی ہے۔ کئی تصویروں میں تو ایک دو طمانچوں کے بجائے چھ سات آٹھ طمانچے مارے جاتے ہیں۔ جہاں کہانی بور محسوس ہونے لگی وہیں طمانچہ پڑ گیا۔ اسی طرح طمانچے کھا کھا کے کہانی آگے چلتی ہے۔

اور جب طمانچے سے کام نہ چلے تو طوفان آجاتا ہے۔ کیونکہ طوفان بھی ط سے ہے۔ ذہنی اور جذباتی طوفان سے کام نہ چلے تو سچ مچ کا طوفان آجاتا ہے۔ بادل کڑکتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے۔ بارش موسلا دھار برستی ہے۔ ایسے میں ہیرو یا



ہیروئن کسی کا ایکسی ڈینٹ لازمی ہے ۔ کوئی نہ کوئی زخمی ہو جاتا ہے اور کہانی آگے کو روانہ ہو جاتی ہے !

اکثر فلموں میں اسی طرح دھکّے دے دے کر کہانی کو اختتام تک پہنچایا جاتا ہے ۔

آپ بھی تو اکثر ایسی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتے ہیں اس لئے مارو اپنے منہ پر طمانچہ اور کہو ——— ط سے طمانچہ !

ظ سے ظالم !

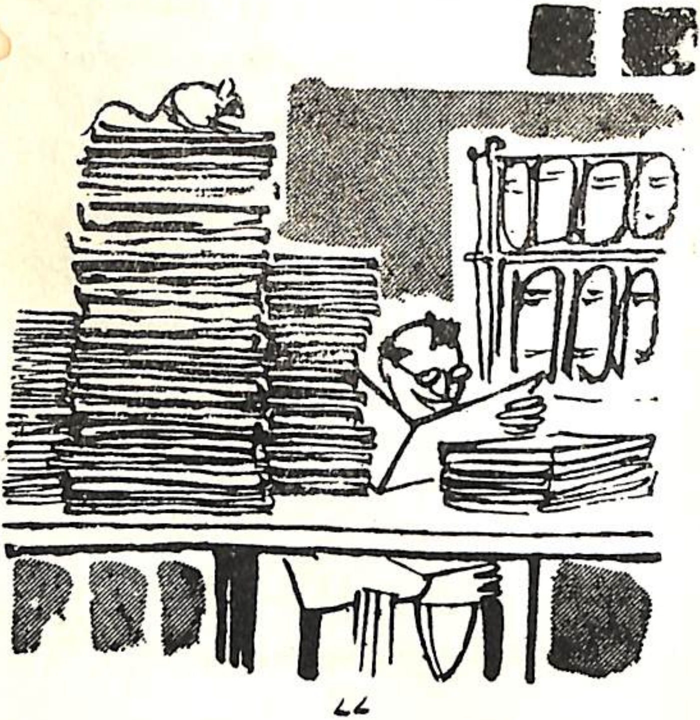
ہر فلم میں ایک ظالم ہوتا ہے اور ظالم کے بغیر کوئی فلم نہیں بنتی ۔ ظالم کی فلم

والے اپنی اصطلاح میں ولین کہتے ہیں ۔ ولین کا مفصّل بیان 'و' میں آئے گا ۔
جب تک اتنا یاد رکھو ۔۔

ظؔ سے ظالم !

عؔ سے عقل !

بچو! عقل اس کو کہتے ہیں جس کی فلم بنانے میں ضرورت نہیں پڑتی ۔ ورنہ ہر عقل والا فلم کا دھندا شروع کر لیتا اور لاکھوں کما لیتا ۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ فلم میں عقل لگاتے ہیں ۔ ناکام رہتے ہیں اور جو لوگ عقل کے بجائے اٹکل



سے کام لیتے ہیں - بہت کامیاب رہتے ہیں -

ایک بچہ بھی فلم بنا سکتا ہے - بشرطیکہ اس کے پاس ڈھیر سارا روپیہ ہو - آجکل ایک معمولی فلم بھی چھ سات لاکھ روپے سے کم میں نہیں بنتی اور اچھی فلمیں تو تیس چالیس لاکھ تک جاتی ہیں - جس فلم میں جتنی کم عقل اور جتنا زیادہ روپیہ استعمال کیا جائے گا - وہ اتنی ہی کامیاب ہو گی !

اگر آپ کے پاس عقل ہے تو اس عقل سے روپے کو خریدنا بہت مشکل ہے لیکن اگر آپ کے پاس روپیہ ہے تو اس سے عقل کو خریدنا بہت آسان ہے - کیونکہ عقل والے ہزاروں کی تعداد میں فلم کے بازار میں اپنے اپنے خوانچے لگائے عقل بیچتے نظر آتے ہیں - کوئی اپنا قلم بیچتا ہے، کوئی اپنا رنگ روپ - کوئی اپنا ہنر - کوئی فن .... جو جس کے پاس ہے بیچتا چلا جا رہا ہے -

آجکل مہنگائی کا زمانہ ہے - سوائے عقل کے ہر چیز کے دام بڑھ گئے ہیں آجکل گو بھی مہنگی ہے مگر عقل سستی ہے - کپڑا مہنگا ہے مگر عقل سستی ہے - مکان مہنگا ہے مگر عقل سستی ہے - اتنی سستی ہے کہ بازاروں میں پڑے پڑے سڑ رہی ہے اور کوئی پوچھتا نہیں .... !

اس لئے بچو ! اگر تم فلم بنانا چاہتے ہو - تو عقل کی دُم میں دھاگا باندھو اور کہو ـــــ

ع سے عقل !

غ سے غنڈہ !

غنڈہ، ولین کا چمچہ ہوتا ہے - غنڈہ ہات چلاتا ہے - پاؤں چلاتا ہے اور سر میں چونکہ عقل نہیں ہوتی - اس لئے سر سے بھی ٹکریں مارنے کا کام لیتا ہے !

غنڈے کو لوگ اکثر بہت بُرا بھلا کہتے ہیں مگر غنڈہ در اصل بہت معصوم اور بھولا بھالا ہوتا ہے۔ وہ بے چارہ تو بالکل بیل ہوتا ہے جس کی نکیل اس کے مالک کے ہات میں ہوتی ہے اور مالک اس کی نکیل سے اسے جدھر چاہے گھما دیتا ہے !

ابھی میں نے غنڈے کو ولین کا چمچہ کہا۔ مگر چمچے اور غنڈے میں بہت فرق ہے ـــــــ ! چمچہ کبھی وفادار نہیں ہوتا۔ غنڈہ ہمیشہ وفادار رہتا ہے ! چمچہ چالاک ہوتا ہے۔ غنڈہ سیدھا سادا ہوتا ہے۔ چمچہ اپنے آپ کو کبھی خطرے میں نہیں ڈالتا۔ غنڈہ اپنے مالک کے لئے جیل تک چلا جاتا ہے۔ غنڈہ بالکل بیل ہے



بیل !

اس لئے بچو ! اگر تم انسان نہیں بیل بننا چاہتے ہو۔ تو کہو۔
غ سے غنڈہ !

ف سے فلم !

جب ہم دودھ پیتے بچے تھے تو ابھی فلم ایجاد بھی نہیں ہوئی تھی۔ آجکل دودھ پیتے بچے بھی فلم دیکھتے ہیں۔ اس لئے فلم کے بارے میں میں آپ کو کیا بتا سکتا ہوں۔ آجکل کے بچے فلم کے بارے میں بڑوں سے زیادہ جانکاری رکھتے ہیں !

ایک دن جب میں محکمہ تعلیم کا ایک انسپکٹر تھا ایک اسکول کا معائنہ کرنے کے لئے پہنچا اور کچھ بتائے بغیر چھٹی جماعت کے بچوں سے سوالات کرنا شروع کر دئے۔ بچوں کی معلومات دیکھ کر میں حیرت میں رہ گیا۔

چند سوال و جواب نمونے کے طور پر تحریر ہیں۔ کیونکہ چند سوالوں کے جواب میں پہلے ہی بتا چکا ہوں !

سوال :۔ ترکوں کے بارے میں اپنی معلومات ظاہر کرو ؟

جواب :۔ زبان یار من ترکی کا گیت دہیں سے آیا ہے۔

سوال :۔ جنوبی ہند کے بڑے بڑے شہروں کے نام لو ؟

جواب :۔ جیمینی، واٹسن ۔ اے وی ایم اور مدراس !

سوال :۔ نورجہاں کا اصلی نام کیا تھا ؟

جواب :۔ نسیم بانو !

سوال :۔ شہید اعظم بھگت سنگھ کون تھا ؟

جواب :- منوج کمار-
سوال :- تاج محل کس نے بنوایا ؟
جواب :- پروڈیوسر کریم بھائی نڈیاڈوالا نے !
اسی قبیل کے جواب سن کر میری معلومات میں وہ شاندار اضافے ہوئے ہیں کہ میں نے اسی جنرل نالج کی بنا پر یہ فلمی قاعدہ لکھنے کی جرأت کی ہے۔
اس لئے بچو ! اپنی درسی کتابوں کو ردّی کی ٹوکری میں ڈالو۔ اور کہو۔
ف سے فلم :

ق سے قینچی !
قینچی سینسر کے پاس ہوتی ہے اور سینسر حکومت کا وہ ادارہ ہوتا ہے جو



کسی فلم کو پاس کرتا ہے یا فیل کرتا ہے۔ جو اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ آیا یہ فلم اس قابل ہے کہ اسے پبلک کو دکھایا جا سکے ؟

فلم پروڈیوسر ایٹم بم سے اس قدر نہیں ڈرتا ہے جس قدر وہ سینسر کی قینچی سے ڈرتا ہے ۔ اگر آپ بھی اپنی فلموں میں وہ مناظر نہیں دیکھتے ہیں، جن کو دیکھنے کی آپ کو ہوس ہے یا حسرت ہے تو اس کے لئے سینسر کی قینچی ذمہ وار ہے ۔ اور اگر کوک شاستر اور فلم میں کوئی فرق باقی ہے تو محض سینسر کی قینچی کے سہارے ۔ اس لئے فلم سینسر بورڈ کی قینچی کو دعا دیجئے اور کہئے ۔

ق سے قینچی !

ک سے کشمیر !

ک سے کشمیر ہے جس کے بغیر آجکل کوئی ہندوستانی فلم مکمل نہیں ہو سکتی ۔ چند سال پہلے یہی حیثیت ناگ کو حاصل تھی ۔ ہر پکچر میں کسی نہ کسی طرح سے ناگ دکھا دیا جاتا تھا ۔ ناگ ہے کہ ہیرو کے سامنے پھن پھیلائے کھڑا ہے ۔ ہیروئن کے قدموں سے لپٹا جا رہا ہے ۔ ولین کو ڈس رہا ہے ۔ کسی نہ کسی شاٹ میں ناگ کو دکھانا ضروری تھا ۔ اس زمانے میں ناگ کے بغیر کوئی پکچر نہیں چل سکتی تھی ۔ آجکل کشمیر کے بغیر نہیں چل سکتی ۔ کہتے ہیں کہ آجکل ہیرو اور ہیروئن فلم کے کانٹریکٹ پر دستخط کرنے سے پہلے پوچھ لیتے ہیں — "کیوں صاحب ! اس فلم میں کشمیر ہے ؟ اگر ہے تو کانٹریکٹ پر دستخط ہو جاتے ہیں ورنہ کہانی بدلنا پڑتی ہے ۔

ک سے کڑکی بھی ہے جو کشمیر سے آنے کے بعد شروع ہوتی ہے ۔ کشمیر میں سیر سپاٹا کرنے اور اندھا دھند روپیہ اڑانے کے بعد فلم کمپنی پر یک لخت کڑکی



چھا جاتی ہے۔ ملازموں کو تنخواہیں نہیں ملتیں۔ ایکٹروں کی قسط روک دی جاتی ہے۔ وہسکی کی بوتلوں میں ٹھرّا ڈال کے پیا جاتا ہے۔ اور آفس کا کرایہ چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ تنگی جسے بمبئی کی زبان میں "کڑکی" کہتے ہیں مہینوں تک چھائی رہتی ہے۔ سب فلم والے کڑکی کا مزہ جانتے ہیں۔ اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ ایک مہینے وہسکی پینا چھ مہینے ٹھرّا پینا۔ ایک مہینہ کرایہ دینا اور دس مہینے نہ دینا۔ ایک مہینہ پلاؤ کھانا اور دوسرے مہینے چنے چبانا ان کی عادت میں شامل ہو چکا ہے۔ سُنا ہے کہ افریقہ کا اونٹ صحرا میں کھائے پیے

بغیر آٹھ دن تک زندہ رہ سکتا ہے لیکن فلم کے ریگستان میں چلنے والے اونٹ مہینوں کھائے پیئے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں ! ——— زندگی کا یہ اتنا بڑا معجزہ ہے جس پر سائینسدانوں کو جلد سے جلد توجہ دینی چاہیئے !

ک سے کہانی بھی ہے مگر چونکہ یہ ہر دوسرے دن بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کچھ کہنا لاحاصل ہے۔

ک سے کمپنی ہے، جہاں فلم کا کاروبار ہوتا ہے۔

ک سے کٹ ہے جو ہر شاٹ کے بعد بولا جاتا ہے لیکن ان سب میں مزے کی چیز کشمیر ہے۔ اس لئے یاد رکھو۔

ک سے کشمیر !

کھ سے کھشیتر (میدان)

کورو کھشیتر میں مہابھارت کی جنگ لڑی گئی۔ فلم کے کھشیتر میں ہر روز مہابھارت کی لڑائی ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں دروپدی کے بجائے ہیروئن کا چیر ہرن ہوتا ہے۔ گیتا کے بجائے چیک بک کا اُپدیش دیا جاتا ہے۔ ارجن کے بان کے بجائے نظروں کے بان چلائے جاتے ہیں۔ شکھنڈی کے بجائے پاکھنڈی آتے ہیں۔ لیکھک کو بھیشم پتامہ کی طرح گھائل کر کے تیروں کے بستر پر لٹا دیا جاتا ہے اور پروڈیوسر اُدھار کا ابھیمنیو چکر چلا کر سب کو الجھاتا جاتا ہے۔ یہاں سنجے کی جگہ ساؤنڈ ریکارڈسٹ ہوتے ہیں اور دیکھنے والے سب دھرت راشٹر کی طرح اندھے ہوتے ہیں !

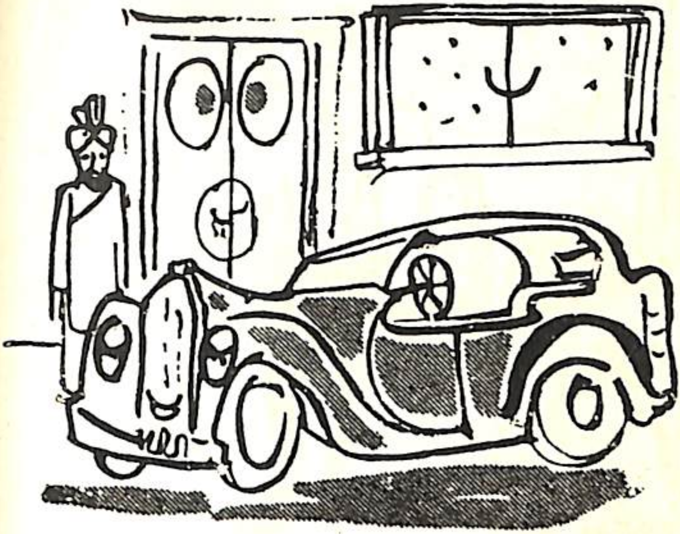
آؤ ۔۔۔۔ آؤ ۔۔۔۔ مہابھارت کی لڑائی دیکھو۔ صرف ایک روپے میں ۔۔۔۔!

کھ سے کھشیتر !



گ سے گاڑی !

گ سے گاڑی، ریل گاڑی نہیں بلکہ موٹر گاڑی - زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح فلم میں بھی گاڑی عزّت کا سب سے بڑا نشان ہے - آجکل آدمی اپنے کام سے نہیں اپنی گاڑی سے پہچانا جاتا ہے - گھر میں چاہے پھُوٹی بھانگ تک نہ ہو - صوفہ نہ ہو - راشن نہ ہو - چائے نہ ہو - بچوں کے لئے اسکول کی فیس تک نہ ہو - لیکن گھر کے باہر گاڑی ضرور کھڑی ہو - جب تک گاڑی چلتی ہے آپ کی فلم چلتی ہے - اسی لئے تو بھگت کبیر نے "چلتی کو گاڑی" کہا ہے اور اسی لئے



فلم میں ہر سمجھدار آدمی گاڑی رکھتا ہے۔ گاڑی نئی ہو یا پرانی۔ اُلٹی ہو یا سیدھی۔ اس سے بحث نہیں۔ لیکن وہ لمبی ضرور ہونی چاہیئے۔ اور جس آدمی کے پاس جتنی لمبی گاڑی ہوگی اتنا ہی لمبا کانٹریکٹ اُسے فلم میں ملے گا۔ اس لئے بھگوان کے بعد ہمیشہ گاڑی کا دھیان دھرو۔ اور کہو۔

گ سے گاڑی ——!

گھ سے گھپلا!

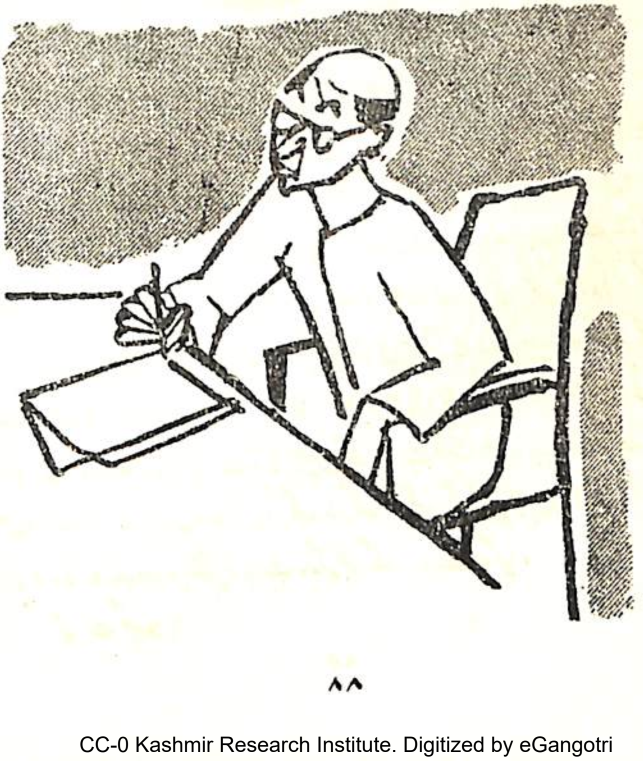
یہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ لیکن فلمی دنیا میں کچھ زیادہ ہی پایا جاتا ہے۔ دوسری جگہوں پر کبھی کبھی گھپلا ہوتا ہے۔ یہاں پوری فلم گھپلے بازی میں بنائی جاتی ہے دوسری جگہوں پر اس لفظ کا استعمال کبھی کبھی ہوتا ہے۔ یہاں ہر روز ہوتا ہے!



ویسے یہ لفظ بہت خطرناک ہے۔ اگر کوئی پروڈیوسر کسی کہانی لکھنے والے کے
کندھے پر ہات مار کر بڑی محبت سے کہے۔ "یار کیا بنائیں؟ عجب گھپلا ہوگیا!"
تو سمجھ لو کہ اس کہانی کار کا اس کی فلم سے پتہ کٹ گیا۔ اگر کوئی ہیرو، پروڈیوسر
سے یہی کہے تو سمجھ لو۔ کہ وہ شوٹنگ کی ڈیٹ کینسل کر کے پندرہ روز کے لئے کہیں
باہر جانے والا ہے۔ اگر ہیروئن یہی کہے تو سمجھ لو کہ وہ اپنی انکم ٹیکس کی اگلی
قسط کے لئے پیسے مانگنے والی ہے اور اگر ڈسٹری بیوٹر، پروڈیوسر سے کہے تو سمجھ لو
کہ وہ اس کا چیک ڈس آنر (DISHONOUR) کرنے والا ہے! کوئی فلم
والا کسی موٹی سے موٹی گالی سے اتنا نہیں گھبراتا ہے جتنا اس ایک لفظ "گھپلے" سے۔
اس وقت چاہے تم اس لفظ کو یاد رکھو نہ رکھو۔ لیکن اگر کبھی فلم میں آگئے تو ہر روز
اس کو یاد کرو گے اور ماتھے پر ہات مار کر کہو گے۔۔ ہائے ہوگیا۔
گھپلا!

ل سے لکھنے والا!

عام لوگوں کا خیال ہے کہ فلم بننے سے پہلے لکھی جاتی ہوگی۔ کبھی کبھار ایسا ضرور ہوتا ہے مگر عام طور پر فلم پہلے بنتی ہے بعد میں لکھی جاتی ہے۔ آپ پوچھیں گے بعد میں لکھنے سے کیا فائدہ؟ —— وہ اس لئے کہ جب فلم تیار ہو کر سنسر کے پاس جاتی ہے تو سنسر اپنی قینچی چلانے سے پیشتر فلم کا کاغذی مسودہ مانگتے ہیں۔ اس لئے لکھنے والے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لکھنے والا جسے کچھ لوگ لکھاک یا ادیب بھی کہتے ہیں۔ اس وقت کام میں آتا ہے اور فلم کو دیکھ دیکھ کر فلم کے مکالمے اور سین ایک بڑی نوٹ بک میں درج کرتا جاتا ہے جسے فلم کے لوگ "چوپڑی"



کہتے ہیں۔ چوپڑی تیار کرنا لیکھک کا سب سے اہم کام ہے!

اس کے علاوہ وہ فلم کے بننے سے پہلے ایک کہانی بھی پروڈیوسر کو سناتا ہے جسے فوراً رد کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لیکھک کو ایک کہانی سنائی جاتی ہے۔ یہ کہانی ڈائریکٹر سناتا ہے۔ ڈائریکٹر کو یہ کہانی پروڈیوسر نے سنائی ہوتی ہے۔ اور پروڈیوسر کو ہیرو نے اور ہیرو کو اس کے سیکریٹری نے اور سیکریٹری نے غالباً کسی ہالی وڈ کی فلم سے چرائی ہوتی ہے۔ اس طرح سے یہ کہانی لیکھک کے گلے منڈھ دی جاتی ہے!

اسی طرح سے منظر نامہ اور مکالمہ تیار ہوتا ہے۔ اسٹوڈیو کے سیٹ پر ہیرو کو گزشتہ رات کی دیکھی ہوئی کسی مغربی فلم کے مکالمے یاد آتے ہیں۔ وہ لیکھک کے بنائے ہوئے مکالمے رد کر کے اسی وقت وہی رات والے مکالمے بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ہیروئن نے بھی کوئی تصویر دیکھی ہوتی ہے جس کے مکالمے اسے پسند ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی پسند کے مکالمے بولتی ہے!

ہیرو سین کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہیروئن اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بے چارہ لیکھک سین کو بچانے کے لئے کبھی ہیرو کی طرف دوڑتا ہے کبھی ہیروئن کی طرف۔ اسی دوران کامیڈین آجاتا ہے اور وہ سین کو اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے۔ اس کھینچا تانی میں اکثر سین پھٹ جاتا ہے۔ پھر اس کے ٹکڑے لیکھک کے حوالے کئے جاتے ہیں اور اسے اسٹوڈیو کے ایک کونے میں بٹھا دیا جاتا ہے تاکہ وہ آرام سے اپنے پھٹے ہوئے چیتھڑوں کو اپنے قلم کی سوئی اور خیال کے دھاگے سے سینے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ سین کو سی کر اور اس کے ٹکڑے جوڑ کر ڈائرکٹر کے پاس واپس آتا ہے تو

اسے معلوم ہوتا ہے کہ سین تو شوٹ ہو چکا!
اسی طرح سین پر سین شوٹ ہوتے رہتے ہیں۔ مکالمے تیار ہوتے رہتے ہیں۔ فلم بنتی رہتی ہے اور جب فلم بن جاتی ہے تو اس پر لکھنے والے کا نام دے دیا جاتا ہے۔ خس کم جہاں پاک!
ل سے لیکھک!

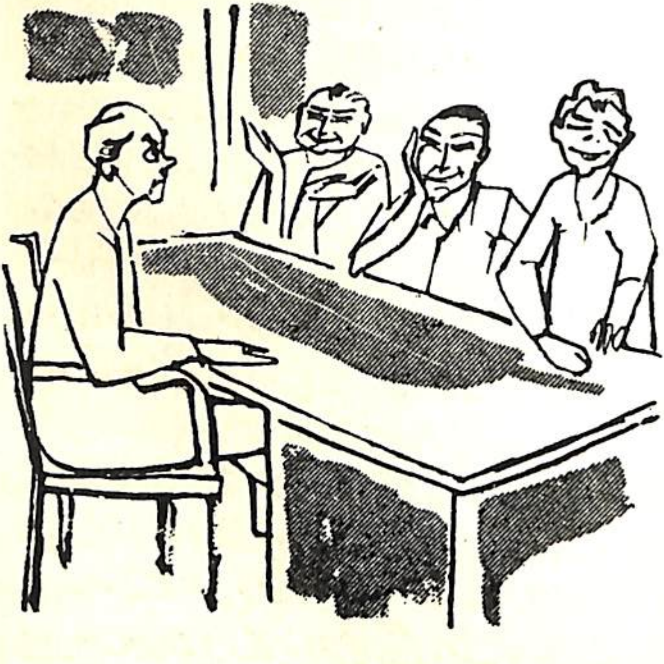
مَ سے مکّھن یا مسکہ!

م سے مکھن جسے بزبان بمبئی مسکہ کہتے ہیں۔ دوسری جگہوں پر مکھن کھایا جاتا ہے۔ بمبئی میں مکھن یعنی صرف مسکہ لگایا جاتا ہے اور اگر ایک بار لگانے سے تشفا نہ ہو۔ تو بار بار لگایا جاتا ہے۔ بمبئی میں مسکہ ہر قسم کا ہوتا ہے اور با افراط ملتا ہے لیکن سب سے اچھا مسکہ وہ ہے جو فلمی ڈیری میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایسا چکنا دبیز اور گداز ہوتا ہے کہ اُسے لگاتے ہی چہرے کے سارے مہاسے اور دل کے داغ غائب ہو جاتے ہیں اور خبیث سے خبیث صورت فلمی انسان بھی فرشتہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ اُس مسکے کے سامنے روغنِ قاز کی بھی کوئی حقیقت نہیں اور جو لوگ باہر جا کر ولایت تک کو ہات لگا آتے ہیں۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ بمبئی کا مسکہ اصل ہے اور باقی سب نقل ہے!

اس مسکے کے لگانے کی بھی ایک ترکیب ہے جو ور اصل مسکے کی ڈبی کے ہمراہ روانہ کی جاتی ہے تاکہ ہر خاص و عام اس سے فائدہ اٹھائیں اور بارگاہ الٰہی میں بندے کے حق میں دعا پہنچائیں!

یوں تو مسکہ لگانے کی بہت سی ترکیبیں ہیں۔ ایک تو وہ ہے جسے بمبئی کے محاورے میں کہا گیا ہے کہ "جیسا منہ ویسا مسکہ"۔ یعنی آدمی جتنا فلمی رُتبے کا

مالک ہوگا۔ اسے اسی اعتبار سے مسکہ لگایا جائے گا اور پھر جوں جوں اس کی فلمی
حیثیت اور رتبہ کم ہوتا جائے گا۔ مسکہ بھی پتلا ہوتا جائے گا۔ حتیٰ کہ آخر میں بالکل
کھوپرے کا تیل ہو کر رہ جائے گا۔ اسی موقع کے لئے بمبئی والے کہتے ہیں "مسکہ
دیکھو مسکے کی دھار دیکھو"۔ لیکن مسکہ پتلا ہو یا گاڑھا۔ دیسی ہو یا ولایتی۔ اسے
ہیروئن کو بہرحال لگانا ہی پڑے گا۔ ورنہ نہ نو من مسکہ ہوگا نہ ہیروئن ناچے گی۔
اور اگر ہیروئن نہیں ناچے گی تو ہندوستانی فلم کیسے بنے گی؟ مسکہ لگانے کی سب
سے اچھی ترکیب میرے عزیز دوست شاعر اختر الایمان نے ڈھونڈھ نکالی ہے۔
وہ اس کے موجد نہیں ہیں۔ اسے انھوں نے اتفاقیہ دریافت کیا ہے۔ چنانچہ حضرت



اختر الایمان ہدایت کرتے ہیں اور خاکسار آپ سے بیان کرتا ہے کہ بہت دن گذرے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عروس البلاد بمبئی میں ایک مشہور و معروف ڈائریکٹر رہتا تھا جس کا نام صادق تھا۔ ہر چند کہ وہ بے ریا اور پاکباز مرد تھا اور اپنے فن میں یکتائے روزگار تھا۔ لیکن مسکہ والے فلاک ناہنجار کی طرح کہاں کسی کا پیچھا چھوڑتے ہیں؟ چنانچہ یہ فلم والے اس ظلم ڈائریکٹر کے گھر پہنچ جاتے اور اسے اس صفائی سے مسکہ لگاتے کہ جس صفائی سے اس نے خود کسی کو مسکہ نہ لگایا ہوگا۔ اور اس کے بعد اپنا کام حاصل کر کے یہ مسکہ باز شادان و فرحان خوشی خوشی کانٹریکٹ حاصل کر کے گھر لوٹتے اور چھوٹتے ہی کسی بار میں بیٹھ کر لال پری کے دورشن کرتے۔ کیونکہ لال پری اور مسکے کا بہت میل جول ہے۔ کبھی مسکہ پہلے آتا ہے لال پری بعد میں۔ کبھی لال پری پہلے مسکہ بعد میں۔ لیکن آتے دونوں ضرور ہیں۔ ہاں جب سے نشہ پانی سرکاری طور سے بند ہوا ہے' یار لوگ سرکاری طور پر مسکہ لگاتے ہیں اور غیر سرکاری طور پر لال پری کا بندوبست کرتے ہیں تاکہ مکھن کی دیانت میں اور دماغ کی خباثت میں کوئی کمی واقع نہ ہو!

روایت کہتے ہیں شاعر اختر الایمان کہ ایک دفعہ وہ چند ماہ سے بیکار تھے۔ اور اس لئے مبتلائے صد آزار تھے۔ وہ باندرہ پل پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اور نیچے سمندر میں کود جانے کی سوچ رہے تھے کہ یکایک ان کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ مرنے سے قبل ایک دفعہ صادق صاحب کے یہاں جاکر مسکہ آزمائی کی جائے۔ شاید امید بر آئے۔ تقدیر سدھر جائے اور کھولی کا کرایہ نکل آئے!
یہ سوچ کر وہ مرد ہندی باندرہ پل سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور دوڑتے دوڑتے صادق صاحب کے مکان پر پہنچا۔ وہ مشہور و معروف ڈائریکٹر اس وقت اپنی کہانی میں ایک سین تبدیل کر کے ہیروئن کی نانی کو ویمپ کا رول دے رہا تھا۔

کہ اختر الایمان نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ دروازہ کھول کر ڈائریکٹر نے شاعر کو گلے لگالیا ۔ اور بڑے تپاک سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اُسے صوفے تک لے گیا ۔ اور اسے اپنے سامنے بٹھا کے بولا ۔ پہلے اپنی نظم سناؤ گے یا پانی پیو گے ؟

اختر الایمان نے کہا "پہلے نظم سناؤں گا ۔ کیونکہ اے دوست پانی پلانے والے تو بہت مل جاتے ہیں لیکن نظم سننے والا کوئی نہیں ملتا ۔ !"

صادق بہت خوش ہوا اور اختر سے اس کی نئی نظم سننے لگا ۔ نظم چونکہ ترقی پسند تھی اس لئے کہیں سے مسکے کی گنجائش نہ رکھتی تھی ۔ نظم سناتے سناتے اختر کو اس کا برابر خیال رہا اور وہ سوچتا رہا کہ اگر وہ پرانے زمانے کا قصیدہ گو ہوتا تو کیا ہی اچھا ہوتا ۔ یا وہ آجکل کے زمانے کا ادب برائے روزگار کا پجاری ہوتا تو وہ نہ صرف ایک قصیدہ لکھتا بلکہ ایک فلمی پرچہ بھی صادق کے نام نکال دیتا ۔ کیونکہ اگر نوشاد کے نام فلمی پرچہ نکل سکتا ہے تو صادق کے نام کیوں نہیں نکل سکتا ۔ پھر شاید ایک دن وہ بھی آجائے کہ فوراً اس کے نام ایک پرچہ نکل آئے ۔ فلمی ہیروئن سے لے کر ڈھونڈو، سیٹنگ بوائے تک کے نام فلمی پرچے چھپنے چاہئیں ۔ اختر نے سوچا ۔ اس کے بغیر فلم انڈسٹری کا نروان مشکل ہے ۔ یہی سوچتے سوچتے اختر الایمان اپنی نظم بھول گیا ۔ صادق نے کہا ۔ آگے سناؤ ــــــ ! اختر نے جلدی سے جواب دیا "بس یہیں تک لکھی ہے ! صادق نے کہا " بہت اچھی نظم ہے لیکن اگر تم اسے گیت میں تبدیل کردو ۔ تو میں ۱۹۷۰ء میں اسے استعمال کرونگا ۔ اختر یہ سُن کر بے حد خوش ہوا کہ آج سے پانچ سال بعد کے روزگار کا مسئلہ تو حل ہوا ۔ اب ان چار سالوں میں جو ہوگا اُسے کسی نہ کسی طرح بھگت لیں گے ۔ یہی سوچ کر وہ آگے مسکہ لگانے کی فکر میں تھا اور جانتا نہیں تھا کہ کون سے ممبر کا مسکہ لگائے کہ

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک دُبلا پتلا آدمی کلّے میں پان دبائے بھاگتا ہوا اندر آیا اور آتے ہی صادق صاحب کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کے بیٹھ گیا۔

صادق نے حیران ہوکر پوچھا "کیا بات ہے بھئی؟"

نووارد نے کہا۔ "انگوٹھا نہیں چھوڑونگا صادق بھائی! چاہے کچھ بھی ہو"

صادق نے اور بھی پریشان ہوکر کہا "آخر کچھ تو کہو کیا بات ہے؟"

نووارد نے پھر کہا۔ "انگوٹھا نہیں چھوڑونگا صادق بھائی! چاہے جان ہی چلی جائے —— !"

صادق نے بے حد پریشان ہوکے کہا۔ "مگر آخر کیوں نہیں چھوڑوگے میرا انگوٹھا۔ کچھ بات تو بتاؤ؟"

نووارد نے پھر اسی لہجے میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "انگوٹھا نہیں چھوڑونگا ایک بات ہے، وہ آپ کو پوری کرنی ہوگی صادق بھائی! ورنہ حشر تک آپ کا انگوٹھا نہیں چھوڑونگا۔"

اور یہ کہہ کر نووارد نے صادق کے پاؤں کا انگوٹھا اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا اور جم کر فرش پر بیٹھ گیا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے صادق کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ آئی اور ایک ایسی ہی مسکراہٹ اختر کے لبوں پر بھی آئی گو وہ اتنی معصوم نہیں تھی۔ اور سنا ہے کہ نووارد نے اپنی بات پوری کرائی اور جب بھی اس نے دیر تک صادق کا انگوٹھا نہیں چھوڑا۔ لیکن یہ بھی روایت ہے کہ اس کے بعد اختر وہاں سے فوراً ہی چل دئے۔ اور جب ان کے ایک عزیز دوست نے ان سے پوچھا۔ تم وہاں کیوں نہیں بیٹھے؟ جس کام کے لئے تم گئے تھے۔ اسے پورا کیوں نہیں کیا؟

نواخترنے ایک آہ بھر کر جواب دیا۔ "اے جاں نثار غمگسار عزیز دوست! تو ہی بتا جب اس نو وارد نے مسکے کے مٹے صادق کا انگوٹھا پکڑ لیا تو میں کیا پکڑتا ہ؟"

جاں نثار دوست یہ سن کر چپ ہو گیا۔ اسی دن سے فلمی دنیا میں انگوٹھا پکڑنے کی رسم عام ہو چلی ہے۔ مرد کا انگوٹھا پکڑا جاتا ہے اور عورت کی انگوٹھی پکڑی جاتی ہے اور اگر پکڑنے والا سمجھ دار ہو اور عورت ہیروئن ہو تو اس کے سارے کے سارے زیور غائب کر دئے جاتے ہیں۔ مگر اس کے لئے کمال مشق اور مہارت کی ضرورت ہے۔ سنا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں اس فن کے اب چند ہی اُستاد باقی رہ گئے ہیں!

آجکل بمبئی کے لوکل اسٹیشنوں پر جہاں آپ کو تیل مالش والے اور بوٹ پالش والے ملیں گے وہاں مسکے باز بھی مل جائیں گے جو ہتھیلی پر مسکے کی ڈلی لئے گھومتے ہیں اور چلا چلا کے کہتے ہیں "مسکہ لگوالو۔ مسکہ لگوالو۔" تیل مالش دو آنے میں ہوتی ہے۔ بوٹ پالش ایک آنہ میں اور مسکہ پالش صرف دو پیسے میں ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو بمبئی شہر مجھے بہت پسند ہے۔ وہاں جس روز میری جیب میں ایک آنہ ہوتا ہے۔ میں دو پیسے کے چنے لیتا ہوں دو پیسے کا مسکہ لگواتا ہوں اور اس کے بعد باندرہ پل پر ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ جاتا ہوں اور تعریف کرتا ہوں، بچّو اس خدا کی جس نے مسکہ بنایا!

ابتدائی مشق!

بچہ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ باپ انگوٹھا پکڑ رہا ہے۔ یہ ہیروئن ہے۔ وہ مسکے کی ڈبی ہے۔ بیچ میں نانی کھڑی ہے۔ کتے کو مسکہ ہضم نہیں ہوتا۔ باقی سب کو ہو

جاتا ہے ؎

مسکے سے مسکہ ملے کر کر لمبے ہات
اور تلسی داس غریب کی کوئی نہ پوچھے بات

تلسی داس کون تھا ؟ اس کا اختر الایمان سے کیا رشتہ ؟
جواب کے لئے انگوٹھا پکڑیئے !

آن سے نخرہ !

کسی زمانے میں صرف فلم پروڈیوسر نخرے کیا کرتے تھے ۔ آجکل نہیں کرتے
کسی زمانے میں ڈائریکٹر نخرے کیا کرتے تھے ۔ وہ زمانے بھی لد گئے ۔ بیچ میں کچھ
عرصے کے لئے سنگیت کار اور گیت کار نخرے کرنے لگے تھے مگر جلد ہی اپنی حیثیت
کو پہچان کے چپ ہو گئے ۔ ہیروئن کہ بے چاری عورت ہوتی ہے ۔ آج بھی نخرے
کرنے پر مجبور ہے مگر اب اس کا زمانہ بھی چلا گیا !

آجکل صرف ہیرو نخرے کرتا ہے ۔ مثال کے طور پر :۔

۱ ۔ جو آدمی اسٹوڈیو میں سب سے آخر اور سب سے لیٹ آتا ہے ۔ وہ ہیرو ہوتا ہے !

۲ ۔ جو میک اپ کرنے میں سب سے زیادہ وقت لگاتا ہے وہ ہیرو ہوتا ہے !

۳ ۔ آٹھ گھنٹے کام کرنے کے بجائے جو صرف چار گھنٹے کے بعد سر درد کا بہانہ کر کے اسٹوڈیو سے رخصت ہو جاتا ہے وہ صرف ہیرو ہو سکتا ہے ۔

۴ ۔ جس کے ڈرائیور کو لوگ سلام کریں ۔ جس کے سیکرٹری کی آمد پر لوگ اسٹوڈیو کے دروازے تک برائے استقبال جائیں جسے دیکھتے ہی سیٹ پر ڈائریکٹر



مسپاہی کی طرح اٹینشن ہو جائے ۔ وہی ہیرو ہوتا ہے ۔

ہیروئن بھی نخرے کرتی ہے مگر کم کم ۔ اس بے چاری کے نخرے نسوانی اور رومانی قسم کے ہوتے ہیں اور زیادہ تر ہیرو کی ذات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ فلم کے دوسرے لوگوں سے اس کا واسطہ بہت کم پڑتا ہے ۔ اصلی نخرہ تو ہیرو کا ہے اور جو آدمی ہیرو کے نخرے میں جتنا زیادہ گرم مصالحہ ڈالے گا اتنا ہی کامیاب ہوگا !

تن سے نخرہ !

اُن سے نام !

ہر فلم کا ایک نام ہوتا ہے ۔ پہلے صرف ایک لفظ والے نام پسند کئے جاتے تھے ۔ جیسے کنگن ۔ بندھن ۔ ملن ——— پھر دو لفظ والے نام پسند کئے جانے لگے ۔ جیسے سدا سہاگن ۔ ہوا سویرا ۔ ہم لوگ ۔ کوہ نور ——— پھر تین الفاظ والے نام فیشن میں آ گئے ۔ جیسے "مانگ کا سیندور" "جنت کی حور" "دل ہے دور" ——— پھر چار لفظوں والے نام پاپولر ہوئے ۔ جیسے "ہمارا کیا ہے قصور" "دل تو ہے مجبور" "ہم یہاں تم وہاں" "چراغ کہاں روشنی کہاں" !

اب نام اتنے لمبے ہو گئے ہیں کہ انھیں پڑھتے پڑھتے فلم کی آدھی ریل ختم ہو جاتی ہے ۔ اس حساب سے اگر نام لمبے ہوتے گئے تو فلم انٹرول کے بعد شروع ہوا کرے گی !

بعض فلموں کے نام اس طرح کے ہوتے ہیں کہ بچے ان کے ذریعے پہاڑے اور گنتی آسانی سے سیکھ سکتے ہیں ۔ جیسے "ایک دو تین" "چار پانچ چھ" ۔ "نو دو گیارہ" "ایک دل چار راہیں" "ایک دل دو افسانے" "ایک آنو آٹھ بہانے" !

بعض ناموں سے جغرافیے کا پتہ چلتا ہے ۔ جیسے "بغداد کا چور" "لکھنؤ کی ڈور" "روہیل کھنڈ کا مور" "لندن کی بھور" "نیویارک کا شور" "افریقہ کا آدم خور" !

ہمارے کچھ فلم سازوں کو کچھ عرصے سے یہ دھن سوار ہے کہ ہمارے اَن پڑھ اور جاہل عوام کو انگریزی سکھائی جائے ۔ اس لئے وہ لوگ اپنی فلموں کے نام صرف انگریزی میں رکھتے ہیں ۔ "لو اِن شملہ" LOVE IN SIMLA "لو اِن ہانگ کانگ" LOVE IN HONGKONG "لو اِن جاپان"

LOVE IN HONOLULU "لو اِن ہونو لو لو" LOVE IN JAPAN

"لو اِن ٹمبکٹو" LOVE IN TIMBAKTU

کچھ لوگ اپنے ناموں میں شجرۂ نصب پر بہت زور دیتے ہیں۔ جیسے "الہ دین کا بیٹا" "ٹارزن کی بیٹی" "شیطان کی خالہ" "سکندر کا چچا" "اشوک کا پوتہ" "تیمور کا نواسہ"۔

کچھ لوگ برتنوں کے نام یاد کراتے ہیں...... جیسے "پریم کی گاگر" "تین کٹورے" "پوجا کی تھالی" "چائے کی کیتلی" "پانی کی بالٹی"! معلوم ہوتا ہے گھر میں برتن ہی نہیں ہیں ——!

آجکل پُراسرار فلموں کا زمانہ ہے۔ ان فلموں کے نام بھی پُراسرار ہوتے ہیں جیسے "وہ کون تھی؟" "وہ کیا تھی؟" "وہ کہاں تھی؟" "وہ کیوں تھی؟" انھیں مزید پُراسرار بنانے کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ "وہ کیا تھی" کے بجائے نام یوں ہو —— "وہ؟ تھی" "وہ!! تھی" "وہ تھی ......!!" — نام کا نام۔ کراس ورڈ کا کراس ورڈ!

پروڈیوسر اگر عقل والا ہو۔ تو نام کے بجائے پہیلی رکھ دے اور لاکھوں کمائے! ان سے نام

ویسے ویلن!

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ لوگ ویلن کو اسکرین پر دیکھتے ہی گالیاں سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ویلن کو فلم میں اسی لئے رکھا جاتا ہے کہ لوگوں کو گالیاں دینے کی جو عادت ہے اس کا مناسب استعمال ہوتا رہے ورنہ عین ممکن ہے کہ ویلن کی غیر موجودگی میں وہ کہیں ہیرو۔ ہیروئن یا پروڈیوسر کو گالیاں سنانا شروع

کردیں - اسی لئے جس ویلن کو جتنی زیادہ گالیاں ملتی ہیں فلم کمپنی سے اُسے اتنے ہی زیادہ پیسے ملتے ہیں! ایک دفعہ میں اپنے ایک ویلن دوست کے ساتھ اس کی پکچر دیکھنے گیا۔ پکچر دیکھنے کے بعد جب ہم سینما سے نکلے تو ویلن رو رہا تھا۔ میں اس کے آنسو دیکھ کر بہت حیران ہوا - پھر خیال آیا کہ فلم چونکہ ایک موثر ٹریجیڈی تھی اس لئے ممکن ہے کہ ویلن اسے دیکھ کر رو رہا ہو - اس لئے میں نے اس سے پوچھا!
"کیا تم اس لئے رو رہے ہو کہ فلم بہت ٹریجک ہے؟"
ویلن بولا - "نہیں - میں تو اس لئے رو رہا ہوں کہ آج ان تین گھنٹوں میں جب تک میں ہال میں بیٹھا رہا کسی ایک آدمی نے مجھے گالی نہیں دی - اب اگلی پکچر



میں یہ پروڈیوسر مجھے کیوں لے گا؟"

یوں تو سب لوگ ویلن کو پسند کرتے ہیں لیکن جو سوکھے، ڈبلے پتلے اور کمزور جسم کے ہوتے ہیں وہ خاص طور پر ویلن کو پسند کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو زندگی میں اگر کسی کو گالی دیں تو دوسرے لوگ مار مار کر ان کی کھال میں بھوسہ بھر دیں۔ اسی لئے ایسے لوگ ہر روز سینما کا ٹکٹ خرید کر ہال میں بیٹھ جاتے ہیں اور ویلن کو دیکھتے ہی اس پر گالیوں کی بوچھار شروع کر دیتے ہیں۔ وہ چیختے ہیں چلاتے ہیں۔ گھونسہ دکھاتے ہیں۔ ان کا بس چلے اور پولیس کا ڈر نہ ہو تو اسکرین بھی پھاڑ دیں۔ ان سب لوگوں کے لئے ویلن ایک نعمت ہے کیونکہ وہ ان کے جیون کی ہر گھٹن کا جواب ہے!

یہ بھی سچ ہے کہ ویلن کے بغیر فلم ایک منٹ سے زیادہ نہیں چل سکتی۔ آپ ذرا سوچئے کہ فلم میں جب ہیرو اور ہیروئن کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ایسے موقعے پر اگر ویلن بیچ میں نہ آئے تو فلم پہلے ہی سین میں ختم ہو جائے اسی لئے تو ویلن کہانی کے بیچ بیچ میں آتا رہتا ہے اور فلم کو آگے چلاتا رہتا ہے۔ ایسے اہم کردار کو فلم میں کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا! دراصل ویلن ہی ایک ایسا کردار ہے جو ہر موقع پر کھلتا ہے۔ اس لئے ....

ویسے ویلن ....!

ھ سے ہیرو یا ہیروئن!

مفصل دیکھو الف سے ایکٹر یا ایکٹریس .... ویسے ہیرو یا ہیروئن کا بیان اس فلمی قاعدے میں اس قدر ہو چکا ہے کہ ان کے متعلق مزید کچھ بتانا تضیع اوقات ہوگا!



ی ے سے یاھُو !

ہر نئی نسل کا ایک نعرہ ہوتا ہے !

جب ہم نوجوان تھے تو ہماری نسل کا نعرہ تھا "انقلاب زندہ باد" !

جب ۱۹۴۲ء کا زمانہ آیا تو اس وقت کی نئی نسل نے نعرہ لگایا ـــــ

QUIT INDIA

"انگریزو ـــــ ہندوستان چھوڑ دو !"

جب انگریزوں نے ہندوستان چھوڑ دیا تو ملک آزاد ہو گیا ۔ آزادی کے بعد ایک نئی نسل پیدا ہو گئی ہے ۔ اس نئی نسل کا نعرہ ہے ۔

"یاھُو !"



روزی نہیں - روٹی نہیں - انقلاب نہیں - تہذیب نہیں - زندگی نہیں -

صرف ——

یاہُو !

جاز کی دُھن پر ناچتے قدموں سے - تھرکتی کمر سے - ہلتے بازوؤں سے - گردش کرتی ہوئی آنکھوں سے جسم کے ڈولتے ہوئے ہر انگ سے - ماضی - حال اور مستقبل کے ہر تقاضے سے بے نیاز ہو کر اپنا پورا حلق پھاڑ کر چلاؤ — "یاھو !"

یاھو فلم انڈسٹری کی نئی نسل کا قومی نعرہ ہے !

ی سے یاھو ——!

آخری مشق

باپ حقّہ پی رہا ہے۔ ماں دال بگھار رہی ہے۔ بیٹا ولایت سے آتا ہے۔ ماں کو پتھر مارتا ہے۔ اس کا نام ٹریجیڈی ہے!

ہیرو آیا۔ ولین بھاگا۔ ہیروئن شرمائی۔ پنڈت نے شادی رچائی۔ لوگ تالی بجاتے ہیں۔ آسمان سے پھول گرتے ہیں۔ اس کا نام کامیڈی ہے!

اشوک کمار ہنستا ہے۔ الہاس گھورتا ہے۔ راجندر کمار مسکراتا ہے۔ دارا سنگھ ڈنڈ پیلتا ہے۔ یہ سوشیل کے ہیرو ہیں۔ وہ سٹنٹ کے گھوڑے ہیں!

کہانی رد کر لا فا مار۔ کہانی رد کر طوفان لا۔ کہانی رد کر گیت گا۔ یہ فلم کے لیکھک ہیں۔ وہ بنارس کے ٹھگ ہیں!

ہیرو دیکھ۔ چمچہ پھیر۔ چالو ہو جا۔ نہیں تو فاقے کر!

نئی چھمیا آئی۔ پرانی ہیروئن گھبرائی۔ ہیرو نے گھیرا۔ شوٹنگ کرتے کرتے ہو گیا سویرا۔

گھپلا کر۔ جھانسہ دے۔ ڈھنڈورا پیٹ۔ سلور جوبلی منا۔

ستاروں کو مسکہ لگا۔ کشمیر لے جا۔ تھیلی کھول۔ یا ھُو بول۔ تو ڈائریکٹر ہے۔ وہ ایکٹر ہے!

فلم سینسر ہوئی۔ فنانسر کی صندوقچی بند ہوئی۔ کٹ کی شروع ہوئی!

باپ گھر میں ہے ہیروئن باغ میں ہے ہیرو درخت پر ہے۔ گانا چل رہا ہے۔ پروڈیوسر گھاس کھا رہا ہے!

موٹر بھاگی۔ گاڑی سے ٹکرائی۔ ہیروئن زخمی ہے۔ ہیرو ڈاکٹر ہے۔ محبت ہوتی ہے۔ فلم بنتی ہے۔ باکس آفس چلتا ہے۔ قوم کا بیڑا غرق ہوتا ہے!

حکایات

گیدڑ کی تلاش

ایک دفعہ کا ذکر ہے - ایک جنگل میں ایک گیدڑ مر گیا۔ اتفاق سے اس جنگل میں وہی ایک گیدڑ تھا - اس لئے گیدڑ کے مرنے کا غم سب کو ہوا - لیکن شیر کو سب سے زیادہ غم ہوا - کیونکہ شیر اور گیدڑ کا جنگل میں ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ جدھر جدھر شیر جاتا ہے گیدڑ اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے - کبھی کبھی آگے بھی جاتا ہے اور شکار کی ٹوہ رکھتا ہے، اور شیر کو آکے بتاتا ہے - کیونکہ گیدڑ خود شکار نہیں کر سکتا - ہمیشہ شیر کے شکار سے اپنا حصہ لیتا ہے جب شیر شکار کر لیتا ہے اور اچھی طرح سے اپنا پیٹ بھر لیتا ہے تو بچا کھچا گیدڑ کے حوالے کر دیتا ہے جس سے گیدڑ کا کام چل جاتا ہے۔

اس کے بعد سنتے ہیں کہ گیدڑ شیر کو جنگل کی تمام خبریں جھوٹی اور سچی سناتا ہے اور مزے مزے کے اسکینڈل بھی - اور جن جانوروں سے اس کی دشمنی ہوتی ہے ان کی چغلیاں کھاتا رہتا ہے - اور شیر کی خوشامد کر کے اور اس کے تلوے چاٹ کر اپنا مطلب نکالتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے شیر گیدڑ سے بہت خوش رہتا ہے -

گیدڑ کو شیر کی ضرورت ہے اور شیر کو گیدڑ کی !

چنانچہ جب گیدڑ مر گیا تو شیر بہت پریشان ہوا - اس نے کسی دوسرے گیدڑ کی تلاش میں سارا جنگل چھان مارا - لیکن جنگل میں اُسے کوئی گیدڑ نہیں ملا - پھر شیر نے اگلے چھ سات دن میں آس پاس کے بہت سے جنگل دیکھ ڈالے - اسے کہیں پر کسی گیدڑ کی صورت نظر نہیں آئی -

"ماجرا کیا ہے ؟" شیر نے پریشان ہو کر جنگل کے سب سے بوڑھے اور عقل مند لومڑ سے پُوچھا - جنگل میں کہیں پر کوئی گیدڑ دکھائی نہیں دیتا !"

عقل مند لُومڑ نے دست بستہ عرض کی "حضور ! جتنے گیدڑ تھے سب شہروں کو چلے گئے ہیں - انہوں نے جنگل چھوڑ کر شہروں میں بود و باش اختیار کر لی ہے !"

"کیوں ——— ؟" شیر نے پُوچھا

"آجکل شہروں میں گیدڑوں کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ فی زمانہ جنگل میں وہی جانور رہ سکتا ہے جو بے حد جفاکش اور محنتی ہو - جو زمانے کے سرد و گرم اٹھا سکتا ہو - اور یہاں آپ جانتے ہیں - کبھی تشکار ملتا ہے - کبھی نہیں ملتا ہے - کبھی گیدڑ کیا شیر کو بھی بھوکا رہنا پڑتا ہے اور گیدڑ تو سدا سے کام چور ہے - اس لئے شہر کو بھاگ گیا ہے -"

شیر یہ تشریح سن کر چُپ ہو رہا - مگر اس کا دل جنگل میں گیدڑ کے بغیر نہیں لگتا تھا - جب چند دن اور گزر گئے اور کہیں پر اسے کسی گیدڑ کی صورت نہ دکھائی دی - تو وہ سیدھا شہر گیا اور وہاں کے ایک روزنامہ اخبار میں اس نے پہلے صفحے پر ایک اشتہار یُوں دے دیا -

گیدڑ کی ضرورت ہے !

جنگل کے ایک شیر کو ایک گیدڑ کی ضرورت ہے !
چالاک ۔ چرب زبان ۔ تجربے کار ۔ شکار کی ٹوہ رکھنے والے
شیر کا دل بہلانے والے ۔ مزے دار پُر لطف اسکینڈل
سنانے والے ایک گیدڑ کی ضرورت ہے ۔ صرف وہی لوگ
درخواست دیں جنھیں اس کام میں پانچ سال کا تجربہ
حاصل ہو !
منتخب گیدڑ کو ڈبل بھتّہ دیا جائے گا ۔ اس کی زندگی
کا بیمہ کیا جائیگا ۔ سیکیورٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کا بھی انتظام
ہے !
شیر سے انٹرویو کا وقت لنچ کے بعد ——
ڈھائی بجے سے ساڑھے چھ بجے تک ——
اس سے پہلے یا اس کے بعد انٹرویو کے لئے آنا خطرے
سے خالی نہیں ہے !

انٹرویو کے لئے پانچ آدمی شیر سے ملنے گئے ۔ شیر یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا
کہ ان پانچوں میں کوئی گیدڑ نہ تھا ۔ سبھی انسان تھے !
"گیدڑ کیوں نہیں آئے ؟" شیر نے پوچھا ۔
"وہ سب کام سے لگے ہوئے ہیں ۔" ایک آدمی نے جواب دیا ۔
"تم کیوں آئے ؟"
"اس لئے کہ ہم بیکار ہیں ۔" دوسرا آدمی سر جھکا کر بولا ۔ شہر میں ہمیں کوئی

کام نہیں ملتا۔ ہمارے بال بچے بھوکے مر رہے ہیں!"
"ہمارے جنگل میں تو کوئی بیکار نہیں رہتا" شیر بولا۔ "پھر انسانوں کی بستی میں لوگ بیکار کیوں رہتے ہیں؟ انسان تو اشرف المخلوقات ہے!"
اس سوال کا کسی آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سب سر جھکائے ہوئے خاموش کھڑے رہے!
انٹرویو کمیٹی میں شیر کے علاوہ عقل مند لومڑ اور چالاک ریچھ بھی شامل تھا۔ ریچھ بولا۔ "ان انسانوں کو واپس شہر میں بھیج دو!"
وہ لوگ چلانے لگے۔ گڑگڑانے لگے۔ "ہمیں شہر میں واپس مت بھیجو۔ ہمیں یہیں جنگل میں کام دے دو۔ ہمیں گیدڑ کا کام دے دو۔ ہم خوشی سے کریں گے!"
لومڑ بولا۔ "کام تم کو دیا جائے گا۔ مگر ایک شرط پر۔ تم میں سے جو شخص بھی گیدڑ کا کام کرنے کا اہل ثابت نہ ہوا۔ اسے شیر کھا جائے گا۔"
"ہمیں منظور ہے۔ مگر کام ملنا چاہیئے۔" آدمی بولے۔
پہلے دن جس آدمی کو گیدڑ کی ڈیوٹی سونپی گئی۔ وہ سب سے لائق تھا۔ اس کے پاس ایم۔اے کی ڈگری تھی۔ شیر نے گھڑی دیکھ کر اس سے کہا۔
"اس وقت دس بجے ہیں۔ ایک بجے تک تم جنگل میں گھومو اور دیکھو کہ میرے لئے خوراک کا بندوبست کہاں ہو سکتا ہے؟ سراغ لے کر آؤ۔ لنچ سے پہلے۔"
وہ آدمی حکم پا کر اسی وقت شیر کے لئے خوراک کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ گیارہ بج گئے۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ تین بج گئے۔ مگر وہ آدمی نہ آیا۔ شیر بھوکا کھڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی پانچ بجے کے قریب وہ آدمی بھاگا بھاگا آیا اور اس نے شیر سے کہا۔

"میں نے سُراغ لگالیا ہے۔ بہت عُمدہ خوراک کا بندوبست ہوا ہے۔ چلئے!"

شیر تو کب سے بُھوکا تھا۔ اسی وقت اس آدمی کے ساتھ چل پڑا۔ چلتے چلتے جنگل کے دُشوار گزار راستوں سے گزرتے ہوئے وہ آدمی شیر کو درختوں سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی وادی میں لے گیا۔ جہاں لانبی ہری ہری گھاس لہلہا رہی تھی!

"کہاں ہے میرا شکار؟" شیر نے اس آدمی سے پُوچھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس آدمی نے ہری ہری گھاس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بے وقوف!" شیر گرجا۔ "تم نے کیا کھا کر ایم۔ اے پاس کیا ہے؟"

"گھاس!" وہ آدمی بولا۔ "میں خالص ویجیٹیرین ہوں اور میں نے علمِ نباتات (باٹنی) میں ایم اے کیا ہے!"

شیر کی دُم غیظ و غضب سے اُونچی ہوتی گئی۔ "احمق! تمہیں یہ تک معلوم نہیں ہے کہ شیر گھاس نہیں کھاتا ہے۔ گوشت کھاتا ہے!"

اس کے بعد شیر اس آدمی پر جھپٹا اور اُسے کھا گیا۔

دوسرے دن دوسرے آدمی کی باری آئی جو گریجویٹ تھا اور بیکاری سے پہلے اس نے ڈیڑھ سال تک ایک ایسی فیکٹری میں کام کیا تھا جہاں پھلوں کے مُربّے بنائے جاتے تھے۔ اس گریجویٹ نے بھی تلاش بسیار کے بعد جنگلی سیبوں کے دو پیڑ دریافت کر لیئے۔ اور شیر کو سیب کھلانے لے گیا اور شیر نے جنگلی سیبوں کو کھانے کے بجائے اس آدمی کو کھا لیا۔

تیسرا آدمی میٹرکولیٹ تھا۔ اور پہلے دونوں آدمیوں سے ہوشیار تھا۔ وہ بہت جلد شیر کے لئے شکار ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ جنگل کی ایک گھنی گھاٹی پر اس نے ہرنوں کا ایک گلّہ چرتے دیکھا اور فوراً بھاگا بھاگا آیا اور شیر کو اطلاع کی۔ شیر نے گھاٹی پر جا کر ایک ہرن کا شکار کر لیا۔ اور اطمینان سے بیٹھ کر لنچ کھانے

لگا ۔خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد شیر ایک طرف کو لیٹ گیا اور بولا۔

"لو ۔اب تم باقی جو بچا ہے اُسے کھالو!"

تیسرے آدمی نے انکار کر دیا ۔" میں برہمن ہوں ۔میں کسی کا جھوٹا نہیں کھاتا ــــــ!"

اس پر شیر نے تیسرے آدمی کو بھی ختم کر دیا۔

اب چوتھے کی باری آئی ۔اس نے پہلے تین آدمیوں کی ناکامی سے سبق سیکھا۔ اس نے نہ صرف شیر کے لئے شکار کا سراغ لگایا بلکہ خود شیر کا جھوٹا گوشت بھی کھایا ۔حالانکہ کچا تھا ۔مگر اس نے بصد شکر کھا لیا۔ پھر شیر نے اطمینان سے پاؤں پسار کر کہا۔

"اب میرے پاؤں دابو!"

چوتھے آدمی نے بڑی محنت سے شیر کے پنجے دابنے شروع کئے ۔شیر نے ایک ڈکار لی ۔ پھر بولا۔

"تم نے شکار کرتے وقت اس چیتے کی بیوی کو دیکھا تھا ۔جو ایک جھاڑی کے قریب کھڑی ہوئی مجھے گھُور رہی تھی ۔ جہاں میں جاتا ہوں وہیں پہنچ جاتی ہے اور عجیب عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگتی ہے ۔میرا خیال ہے۔مجھ پر عاشق ہے!"

"کسی دوسرے کی بیوی کی طرف نگاہ اٹھانا گناہ ہے۔" چوتھا آدمی بولا۔

"پھر میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ چیتنی آپ پر نہیں اپنے خاوند پر عاشق ہے ۔بڑی محبت سے اس کی کھال چاٹ رہی تھی اور جب آپ قریب سے گزرے تو اس نے آپ کو دیکھ کر منھ پھیر لیا تھا!"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" شیر غصّے سے گرجا ۔" وہ چیتنی مجھ پر عاشق ہے!"

"عاشق نہیں ہے "۔ چوتھے آدمی نے اصرار کیا۔

نتیجے میں شیر اسے بھی کھا گیا۔

اب پانچویں کی باری آئی - وہ آدمی بہت دُبلا پتلا اور ایک عرصے سے فاقہ زدہ معلوم ہوتا تھا۔ بڑے تیز تیز قدموں سے سارے جنگل میں گھوم آیا۔ مگر اسے اپنی مرضی کا کوئی شکار جنگل میں نہیں ملا۔ تو وہ شیر کو لے کر ایک جنگل کے کنارے ایک جھونپڑے میں لے گیا۔ جہاں بہت سی بھیڑ بکریاں بندھی تھیں۔ شیر نے چار پانچ بکریوں کا شکار کیا اور جنگل میں لاکر اس نے دو بکرے بڑے مزے سے کھائے اور باقی تین بکریوں کی لاشوں کو اس نے رات کے کھانے کے لئے رکھ دیا۔ شیر اس آدمی سے بہت خوش ہوا۔

رات کے کھانے پر شیر نے دیکھا کہ اس آدمی نے کچھ کہے سنے بغیر اس کے پاؤں دابنے شروع کر دیئے ہیں۔

شیر نے پوچھا۔ "ایسے لذیذ شکار کا تم نے پتہ کیسے لگایا؟"

"سرکار۔" پانچواں آدمی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں جب جنگل کو آ رہا تھا تو راستے میں ایک رات میں نے اس چرواہے کے جھونپڑے میں گزاری تھی اور چرواہے نے مجھے رات کو بکری کا دودھ اور مکّی کی روٹی پیش کی تھی - اور ازراہِ مہمان نوازی میرے پاؤں بھی دابے تھے۔"

"بہت خوب!" شیر نے تعریفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔ "تم احسان فراموش ہو - اس لئے بہت اچھے گیدڑ ثابت ہو سکتے ہو!"

"حضور کی عنایت ہے۔" وہ آدمی پاؤں دابتے ہوئے بولا۔ "ورنہ میں کس لائق ہوں۔ آپ ایسا بہادر اور خوبصورت شیر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ سچ کہتا ہوں۔ بڑے بڑے جنگل گھوما ہوں مگر وہ وجاہت وقار اور دبدبہ جو آپ کی شخصیت میں ہے۔ میں نے کسی دوسرے شیر میں نہیں دیکھا۔ مردانہ حُسن تو آپ پر ختم ہے!"

" میں خوبصورت ہوں؟" شیر نے پوچھا۔

"مجھ سے کیا پوچھتے ہیں آپ۔ ذرا آپ نے اس چیتنی کو دیکھا ہوگا جو آپ کے شکار کرتے وقت مسحور نگاہوں سے آپ کو دیکھ رہی تھی اور ایک چیتنی پر کیا موقوف ہے۔ درخت پر بسیرا کرنے والی ایک حسین و جمیل بندریا بھی پیڑ کی شاخ سے لپٹی لپٹی آپ کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھر رہی تھی۔ اس ناچیز و حقیر کا خیال تو یہ ہے کہ اس جنگل میں جتنی عورتیں ہیں سب آپ پر عاشق ہیں!"

شیر پانچویں آدمی کی باتیں سن کر بہت خوش ہوا۔ بولا "تم واقعی بہت اچھے گیدڑ ثابت ہوگے۔ بہت عمدہ۔ آج سے میں تم کو اپنی ملازمت میں لیتا ہوں۔ اور تمہاری جان و مال کی ضمانت دیتا ہوں۔"

اس آدمی نے شیر کا پاؤں چوم لیا۔

شیر بولا "ایک بات بتاؤ۔ تم اس سے پہلے کیا کرتے تھے؟"

اس آدمی نے سر جھکا کر کہا "حضور! آپ کی ملازمت میں آنے سے پہلے میں ایک فلمی ہیرو کا چمچہ تھا!"

جانی واکر اور شیر

راوی روایت کرتا ہے کہ ایک دفعہ مشہور کامیڈین جانی واکر کو کسی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے بھوپال کے جنگلوں میں جانا پڑا۔ یہ ایک رنگین تاریخی تصویر تھی۔ جس میں مشہور ہیرو دشینت کمار لیڈنگ رول کر رہا تھا اور اس کے بالمقابل مس کھرچنا ہیروئن کا کام کر رہی تھی۔ جانی واکر نے پروڈیوسر کو بتایا تھا کہ شکار کے مناظر شوٹ کرنے کے لئے بھوپال کے جنگل بہترین ثابت ہونگے!

چنانچہ ایک دن پروڈیوسر اپنی بیوی۔ ہیرو اور اس کی تین معشوقائیں، ہیروئن اور اس کی دو مائیں (ایک سگی دوسری سوتیلی) جانی واکر اور اس کی چار بندوقوں کو لے کر مع عملے فیلے کے بمبئی سے روانہ ہوا۔ تین دن بھوپال میں رہنے کے بعد اور ناؤنوش کا مناسب انتظام کرنے کے بعد یہ قافلہ کھیدرواہ کے جنگلوں کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں آؤٹ ڈور شوٹنگ ہونے والی تھی!

پہلا پڑاؤ کھیدرواہ کے ڈاک بنگلے اور ڈاک بنگلے کے باہر خیمے لگا کر کیا گیا۔ کھیدرواہ کے ڈاک بنگلے سے کھیدرواہ کا جنگل صرف ڈیڑھ میل دور ہے۔

دشوار گزار پہاڑی علاقہ ہے۔ اور ڈاکوؤں اور شیروں سے بھرپور۔ شکار کے لئے آئیڈیل علاقہ ہے اور اسی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے بھی جس میں ڈشینٹ کمار مشہور ہیرو کو یکے بعد دیگرے تین شیروں کا شکار کرتے ہوئے دکھایا جانے والا تھا۔ تاکہ اس کی بہادری کا سکہ جنتا پر جم سکے۔

پروڈیوسر نے ہیرو کی اس بے مثل اور شاندار بہادری کو شوٹنگ کرنے کے لئے ہر طرح کا انتظام کر رکھا تھا۔ تین پیٹیاں شراب کی تھیں۔ دو شکاری بھوپال کے تھے۔ چھ توڑے دار بندوقیں تھیں اور بھالے۔ تیر کمان جو پرانے زمانے میں شکار میں استعمال کئے جاتے تھے۔ وہ سب تھے۔ اس کے علاوہ اس نے بھوپال سے دو ڈاکٹر بھی مرہم پٹی کے لئے ساتھ لے لئے تھے۔ اس کے علاوہ تین شیروں کی کھالوں کو لے کر ان میں بھوسہ بھر والیا تھا اور اب یہ شیر بالکل اصلی لگ رہے تھے۔ یہی وہ شیر تھے۔ جن کا شکار ہیرو نے کرنا تھا۔ مگر جنگل میں۔ یعنی شیر نقلی ہوں گے مگر جنگل اصلی ہوگا۔

دوسرے روز عین آؤٹ ڈور شوٹنگ کے موقعے پر ہیرو نے جنگل میں جانے سے انکار کر دیا۔ بولا۔

"مجھے ان شیروں سے ڈر لگتا ہے!"

"مگر یہ شیر تو نقلی ہیں اور ان میں بھوسہ بھرا ہوا ہے"۔ جانی واکر نے ہیرو کو سمجھایا۔ "ان شیروں کو شکار کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے!"

"کیا معلوم بھئی"۔ ہیرو بولا۔ "آخر شیر کی کھال ہے۔ کس وقت غصہ میں آجائے!"

"احمق مت بنو"۔ جانی واکر بولا۔ "سیدھے سیدھے شوٹنگ کو چلو۔ تمہاری حفاظت کا ہر طرح سے بندوبست کر دیا گیا ہے!"

ہیرو جانے پر راضی ہوا تو گھوڑے دیکھ کر بولا "میں ان گھوڑوں پر نہیں چڑھ سکتا - یہ تو بالکل اصلی گھوڑے معلوم ہوتے ہیں!"

"ہاں - اصلی تو ہیں"۔ جانی واکر نے کہا۔

"کہیں میں گر گیا تو؟" ہیرو بولا "وہ بے چارے شیام کا قصہ تو تمہیں معلوم ہے - جو شوٹنگ کے دوران گھوڑے سے گر کر مر گیا تھا - ناں بھئی! میں اصلی گھوڑے پر نہیں چڑھونگا۔"

پروڈیوسر نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "اب میں نقلی گھوڑے کہاں سے لاؤں جن کی کھال میں شیر کی کھال کی طرح بھوسہ بھر دیا گیا ہو - اگر کسی طرح سے ہم بھی پہنچا دیں تو ایسا گھوڑا چلے گا نہیں!"

جانی واکر بولا "ایک کام تم کر سکتے ہو - اپنی کھال میں بھوسہ بھر لو اور ہیرو کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر جنگل میں لے چلو!"

"مذاق مت کرو جانی بھائی! وہ میرا فلم فنانسر پہلے ہی سے میری کھال میں بہت بھوسہ بھر چکا ہے!"

آخر یہ طے کیا گیا کہ ہیرو کی جگہ ایک ڈبل کو استعمال کیا جائے یعنی ایک ایسا آدمی جس کی شکل ہیرو سے ملتی جلتی ہو - اور جو اصلی گھوڑے پر چڑھنے سے انکار نہ کرے مگر نہ کیمپ میں ایسا آدمی تھا - نہ بھوپال میں - بڑی مشکل سے بمبئی سے ایک ڈبل منگایا گیا اور آؤٹ ڈور شوٹنگ شروع کرنے کا بندوبست کیا گیا مگر اب ایک اور مشکل پیش آئی - ہیرو ڈاک بنگلے میں اکیلا رہنے کو تیار نہ تھا - چنانچہ اس کی حفاظت کے لئے دو شکاری ڈاک بنگلے میں چھوڑ دئے گئے! ادھر پروڈیوسر نے ہیرو کے ڈبل کو لے جا کر کھیوڑہ کے جنگل میں شوٹنگ شروع کی اور تین دن کی زبردست شوٹنگ کے دوران تینوں بھوسہ بھرے ہوئے شیر شکار کر لئے۔

چوتھے دن ایک کامیڈی سین تھا۔ جس میں دکھایا گیا تھا کہ ہیرو کے دربار کے مسخرے (جانی واکر کو یہ پارٹ کرنا تھا) کی اچانک اسی شکار کے دوران ایک شیر سے مٹھ بھیڑ ہو جاتی ہے اور اس وقت جانی واکر بالکل نہتا ہے اور شیر بالکل سر پر آن پہنچا ہے۔ اس وقت جانی واکر اپنی اداکاری کے کمال دکھاتا ہے اور شیر کو اتنا ہنساتا ہے۔ اتنا ہنساتا ہے کہ شیر ہنستے ہنستے مر جاتا ہے۔

اس سین میں جانی واکر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس درجہ اپنے کمالات کا فن دکھائے گا کہ فلم دیکھنے والے اگر ہنستے ہنستے مریں گے نہیں تو پیٹ پکڑ کر لوٹ پوٹ ضرور ہو جائیں گے۔

سین شروع ہوا۔ جنگل میں بھوسہ بھرا ہوا شیر رکھ دیا گیا۔ اس کا منہ اس طرح کھلا تھا جیسے شیر واقعی ہنس رہا ہو۔ جانی واکر نے اپنے کمالات دکھانے شروع کئے۔ کیمرہ چلنے لگا۔

یکایک ایک زور کی دہاڑ سنائی دی اور دوسرے لمحے میں لوگوں نے دیکھا کہ گھنے جنگل کے اندر سے واقعی ایک شیر، ایک سچ مچ کا شیر دہاڑتا ہوا جانی واکر کی طرف بڑھ رہا ہے!

چاروں طرف بھگدڑ مچ گئی۔ کیمرہ مین کیمرہ چھوڑ کر بھاگا۔ سب لوگ ادھر اُدھر تتر بتر ہو گئے اور درختوں پر جا چڑھے۔ صرف جانی واکر اکیلا رہ گیا۔ کیونکہ اس کی پیٹھ اصلی شیر کی طرف تھی اور وہ نقلی شیر کو خوش کر کے ہنسا رہا تھا۔

جب جانی واکر مڑا تو اس نے اپنے سامنے اصلی شیر کو منہ کھولے پنجے پھیلائے غراتے ہوئے دیکھا۔

"اب ہنساؤ مجھے"۔ اصلی شیر نے جانی واکر سے کہا۔

جانی واکر ——— کاٹو تو بدن میں لہو نہیں ——— یہ حال تھا اس کا۔

"ہاں .... ہاں ...... ہنساؤ" اصلی شیر بولا - میں تمہیں ہنسانے کے لئے دو منٹ دیتا ہوں - اگر تم مجھے ہنسا سکے تو جان بخش دونگا - ورنہ کھا جاؤنگا -"

جانی واکر چپ چاپ دم بخود کھڑا رہا - ایک منٹ گزر گیا - دوسرا منٹ گزر گیا -

شیر بولا "مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ جانی واکر!"

درختوں پر چڑھے سب لوگ دم سادھے جانی واکر اور شیر کو دیکھ رہے تھے -

جانی واکر نے کہا - "مجھے کھانے سے پہلے میری ایک بات سُن لو!"

"سناؤ!" شیر نے وہیں سے گرج کر کہا -

"وہ بات کان میں بتانے کی ہے" جانی واکر نے شیر سے کہا -

شیر جانی واکر کے قریب آیا - جانی واکر نے جھک کر شیر کے کان میں کچھ کہا - سنتے ہی شیر نے منہ پھیر لیا - اور دوڑتا ہوا جنگل کے اندر غائب ہو گیا -

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا - پھر جانی واکر نے درختوں پر چڑھے آدمیوں سے کہا -

"اتر آؤ - نیچے اتر آؤ - شیر اب یہاں نہیں آئے گا -"

وہ - ایک آہستہ آہستہ کر کے سب لوگ درختوں سے نیچے اتر آئے - سب لوگ جانی واکر کے گرد اکٹھا ہو گئے - پروڈیوسر نے اس سے کہا "آخر تم نے شیر کے کان میں ایسی کون سی بات کہہ دی - جسے سنتے ہی وہ دُم دبا کر بھاگ گیا -

جانی واکر مسکرا کر بولا ـــــــ "میں نے صرف اتنا کہا تھا ـــــــ میاں شمشیر خاں! میں جانی واکر نہیں ہوں۔ میں اصل میں ایک انکم ٹیکس آفیسر ہوں!"

●

ناگ منی!

ایک دفعہ کا ذکر ہے مغربی گھاٹ کے ایک گھنے جنگل میں ڈھاک کے ایک پیڑ کے نیچے ایک آدمی پڑا سوتا تھا۔ جب آدھی رات اِدھر ہوئی ۔آدھی رات اُدھر ہوئی تو اس پیڑ کی شاخ پر اُلّوؤں کا ایک جوڑا کہیں دُور سے اُڑتا ہوا آیا اور بیٹھ کر سُستانے لگا۔

نیچے سوئے ہوئے آدمی کو دیکھ کر اُلّو نے اُلّن سے کہا۔ "اے بیوی! اس پیڑ کے نیچے جو مسافر پڑا سوتا ہے، جانتی ہے کون ہے یہ؟"

"کون ہے؟" اُلّن نے پوچھا۔ پھر نیچے سوئے ہوئے مسافر کے پھٹے پُرانے کپڑے دیکھ کر بولی ۔"مجھے تو بے چارہ کوئی بھک منگا یا فقیر لگے ہے!"

"یہ فقیر نہیں ہے"۔ اُلّو بولا ۔"اس کا نام کھوٹے لال ہے۔ کسی زمانے میں یہ شہر بمبئی کا ایک بہت بڑا بزنس مین تھا ۔ اس زمانے میں پورے شہر بمبئی میں اس کا طوطی بولتا تھا۔ آجکل اُلّو بولتا ہے ۔ یہ اس پیڑ کے نیچے دیوالیہ ہو کر سو رہا ہے ۔ صبح سویرے یہ یہاں سے اُٹھ کر گھاٹ کی چوٹی پہ جائیگا اور چھلانگ لگا کر خودکشی کر لے گا!"

"ہائے ہائے" اُلّن کہ آخر عورت تھی۔ بڑی ہمدردی سے سوتے ہوئے مسافر کو تاکتے ہوئے بولی۔ "مہاراج اس غریب کو کسی طرح سے بچا لیجئے!"

"نہیں" ۔ اُلّو بڑی سختی سے بولا۔ "تو نہیں جانتی نیک بخت ۔ یہ آدمی اسی سلوک کا مستحق ہے ۔ جن دنوں میں یہ شہر بمبئی میں بزنس کرتا تھا ۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا ۔ بات بے بات ہر کسی کو "اُلّو کا پٹھا کہتا تھا!"

"اُلّو کا پٹھا کہتا تھا ۔ تو کیا بُرا کہتا تھا ۔ ہم دونوں اُلّو ہیں ۔ بلکہ آپ تو دنیا کے سب سے بڑے اُلّو ہیں" ۔ اُلّن بولی ۔ "اُلّو ہونے میں کیا بُرائی ہے؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو نیک بخت! جانوروں کی بستی میں اُلّو سب سے عقل مند مانا جاتا ہے ۔ لیکن انسانوں کی بستی میں عقل مند اُلّو کو سب سے بیوقوف سمجھا جاتا ہے ۔ اسی لئے انسانوں کی بستی میں جب کھوٹے لال کسی کو اُلّو کہتا تھا تو وہ صرف نہ اس انسان کی بے عزتی کرتا تھا بلکہ ہم اُلّوؤں کی بھی!"

"بہت بُری بات ہے ۔ کسی کو گالی دینا ۔ چ چ چ ......" اُلّن بولی۔ "مگر اس وقت بے چارہ دیکھئے کس حالت میں پڑا سو رہا ہے ۔ ضرور اس کی مدد کیجئے مہاراج!"

"نہیں میں ہرگز اس کی مدد نہیں کروں گا" ۔ اُلّو نے تیکھے لہجے میں کہا ۔ حالانکہ میں چاہوں تو اس کی مدد کر سکتا ہوں!"

"وہ کیسے مہاراج؟"

"سنو ۔ پیاری! اگر یہ آدمی جو اس وقت نیچے پڑا بے سدھ سوتا ہے ۔ صبح اٹھ کر پہاڑ کی چوٹی سے کود کر خودکشی کرنے کے بجائے نیچے گھاٹی میں اتر جائے اور سات کوس تک چلتا جائے تو سات کوس کے سفر کے بعد اس کو سات دروازوں والا ایک قبرستان دکھائی دے گا جس کے ہر دروازے کے باہر ایک مجاور بیٹھا ہوگا ۔ یہ مجاور دراصل مجاور نہیں ہیں بلکہ پرانے فلمی لیکھک ہیں جو فلموں میں کام نہ ملنے سے قبرستانوں

کی مجاوری کرنے لگے ہیں۔ یہ سات مجاور اس سے سات سوال کرینگے اور اگر اس مسافر نے جو اس وقت مدہوش پڑا سوتا ہے' ان مجاوروں کے سات سوالوں کا ٹھیک سے جواب دے دیا تو وہ اسے آگے جانے دینگے ورنہ وہیں قبرستان میں گاڑ دینگے!"

"ہائے بیچارہ!" اُلّن نے ہمدردی سے سر ہلا کے کہا۔

"اگر یہ ان سات مجاوروں سے بچ گیا اور آگے چلا گیا۔ تو آگے پھر بڑی مصیبت ہوگی۔"

"کیا ہوگی؟" اُلّن نے پوچھا۔

"مثال کے طور پر اگر یہ قبرستان سے داہنی طرف کو مڑ گیا تو راستے میں اسے گہری دلدل ملے گی جہاں سات مگرمچھ رہتے ہیں۔ وہ کھا جائیں گے لیکن اگر یہ مسافر دائیں طرف جانے کے بجائے بائیں طرف کو مڑ گیا تو سات میل کی دوری پر اسے سات بُرجیوں والا ایک قلعہ ملیگا۔ پرانا قلعہ۔ اس قلعے کی ساتویں بُرجی میں وہ کنجی رکھی ہے جس سے قلعے کا تہ خانہ کھُلتا ہے!"

"تہ خانے میں کیا ہے؟"

"شاہی خزانہ ہے"۔ اُلّو بولا۔"اور اتنا بڑا۔ اتنا قیمتی شاہی خزانہ ہے کہ یہ شخص ساری زندگی عیش و آرام سے رہ سکتا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اس خزانے پر ایک ناگ کا قبضہ ہے۔ یہ ناگ پچھلے جنم میں فلم فنانسر تھا اور اب اس خزانے پر کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ اور کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا۔ بہت سے لوگ اس شاہی خزانے کی تلاش میں وہاں گئے مگر کوئی زندہ نہیں لوٹا۔ ہاں اگر یہ مسافر کسی طرح وہاں تک پہنچ جائے اور اس ناگ کی خوشنودی حاصل کر لے تو اس کی قسمت بدل سکتی ہے مگر یہ بیوقوف تو پڑا سوتا ہے، اسے کچھ نہیں ملے گا!"

اتنا کہہ کر اُلّو اپنی اُلّن کو لے کر پرواز کر گیا۔ ان کے جانے کے بعد کھوٹے لال نے کروٹ بدلی اور آنکھیں کھول کر اوپر دیکھا۔ دراصل وہ سوتا نہ تھا بلکہ جاگ

رہا تھا۔ اُس نے اُلّو کی سب باتیں سن لی تھیں اور سُن کر گرہ میں باندھ لی تھیں۔

دوسرے دن پَو پھٹتے ہی کھوٹے لال اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس نے خودکشی کا خیال ترک کر دیا۔ اور خزانہ ڈھونڈنے کو چل پڑا۔ سات کوس نیچے گھاٹی میں سفر کرنے کے بعد اُسے سات دروازوں والا قبرستان دکھائی دیا۔ جب کھوٹے لال قبرستان کے پہلے دروازے پر پہنچا۔ تو اُسے سب سے پہلا مجاور دکھائی دیا۔ اس کی گھنی ڈاڑھی تھی۔ مونچھیں خوفناک تھیں۔ اور آنکھیں لال تھیں۔ اور وہ مجاور اپنے ہاتھ میں ایک بندوق تانے کھڑا تھا!

"ہالٹ" پہلے مجاور نے کہا: "مرنے کے لئے تیار ہو جا!"

"مگر کیوں؟" کھوٹے لال بولا "میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

"تیرا قصور یہی ہے کہ تو ادھر کیوں آنکلا؟ کیا تجھ کو معلوم نہیں ہے کہ یہ زندوں کا قبرستان ہے؟"

"زندوں کا؟" کھوٹے لال نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"ہاں!" یہاں مُردے نہیں گاڑے جاتے ہیں بلکہ زندہ لوگ گاڑ دیئے جاتے ہیں"۔

"کیا میری جان بخشی کی کوئی صورت نہیں ہے؟" کھوٹے لال نے پوچھا۔

"ہے" وہ مجاور بولا "اگر تو میرے سوال کا ٹھیک جواب دے تو تجھے دوسرے دروازے پر جانے دونگا۔ ورنہ یہیں زندہ گاڑ دُونگا۔"

"سوال کرو!" کھوٹے لال نے کہا۔

"بتا۔ سال میں سب سے اچھا ہفتہ کونسا ہوتا ہے؟" پہلے مجاور نے پوچھا۔

"پچیسواں!" کھوٹے لال نے کہا: "جب فلم کی سلور جوبلی ہوتی ہے!"

"شاباش! تو آگے جا سکتا ہے دوسرے دروازے پر!"

دوسرے دروازے پر پھر دوسرے مجاور نے روک لیا اور اسی طرح

زندہ گاڑ دینے کی ٹھانی۔ کھوٹے لال نے جان بخشی چاہی - مجاور نے سوال کرنا چاہا!
کھوٹے لال بولا۔

"سوال بے شک کرو۔ مگر دوسرے مجاوروں کو بھی بُلا لو۔ ہر دروازے پر موت کی دھمکی دینے سے یہی بہتر ہے کہ تم سب مل کر اکٹھے سوال کرو۔ اگر جواب تسلی بخش ثابت ہوئے تو مجھے ساتویں دروازے سے گزر جانے دینا۔ ورنہ یہیں گاڑ دینا۔"

تجویز معقول تھی۔ دوسرے مجاور نے باقی مجاوروں کو بُلا لیا۔ پہلا مجاور تو اپنا سوال کر چکا تھا۔ اب دوسرے مجاور کی باری تھی۔ اس نے پُوچھا۔

دوسرا مجاور :- اگر تمہارے پاس کہیں سے اسّی لاکھ روپیہ آجائے تو تم کونسی فلم بناؤ گے؟"

جواب :- میں فلم بناؤنگا ہی نہیں!"

تیسرا مجاور :"- صوفیوں نے عشق کی تین منزلیں مقرر کی ہیں۔ ان تینوں منزلوں کے نام بتاؤ؟"

جواب :"- پہلی منزل روپیہ - دوسری منزل فلم - تیسری منزل دیوالیہ!"

چوتھا مجاور :"- کچھ لوگ عورتوں کو پردے میں رکھنے کے حق میں ہیں کچھ لوگ اس کے خلاف ہیں۔ تمہارے خیال میں کیا صحیح ہے؟"

جواب :"- میں عورتوں کو ہر وقت پردے میں رکھنے کے حق میں ہوں بشرطیکہ وہ اسکرین کا پردہ ہو!"

پانچواں مجاور :"- اگر میونسپلٹی کے نل میں پانی نہ آئے تو کیا کرنا چاہیئے؟"

جواب :"- ٹھرا پینا چاہیئے!"

چھٹا مجاور :"- اگر کسی کو اس دنیا میں چمچہ گیری نہ آتی ہو تو وہ کیا کرے؟"

جواب :- وہی کرے جو آپ کر رہے ہیں۔"

یہ جواب سنتے ہی ساتواں مجاور۔ کوئی سوال کئے بغیر مسافر کے قدموں میں لیٹ گیا اور وہ ساتوں مجاور اس کے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگے - اور اسے اپنے ساتھ رکھنے

پر اصرار کرنے لگے " آج سے تم ہمارے گورو ہو ہم تمہارے چیلے۔ ہمارے ساتھ رہو۔ ہم دن رات تمہاری خدمت کرینگے!"

کھوٹے لال نے کہا۔ " جہاں میں جا رہا ہوں وہاں اگر میرا کام نہ بنا تو یہیں آ کر رہ جاؤنگا۔"

کھوٹے لال نے ان سے وعدہ کیا اور وہاں سے رخصت ہوا اور مگرمچھوں والی دلدل سے کترا کر سیدھا اُلّو کے بتائے ہوئے راستہ پر پرانے قلعے میں پہنچ گیا۔ اور ساتویں بُرجی میں رکھی ہوئی کنجی حاصل کر کے قلعے کے تہ خانے میں پہنچ گیا!

تہ خانے میں جاتے ہی اُسے ایک خوفناک پھنکار سنائی دی۔ کھوٹے لال سہم کر دروازے میں کھڑا رہ گیا۔ سارا تہ خانہ مُردوں کی ہڈیوں اور سوکھے پنجروں سے بھرا ہوا تھا۔ دیواروں پر جالے لٹک رہے تھے۔ مگر تہ خانے میں گلابی رنگ کی دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ اور یہ روشنی ناگ کے منہ سے نکلتی تھی۔ یہ ناگ منی کی روشنی تھی۔ ناگ کے منہ میں ایک بہت بڑا لعل رکھا ہوا تھا۔ اُس لعل کی روشنی سے نور چھن چھن کر تہ خانے کی در و دیوار کو منوّر کر رہا تھا۔

کھوٹے لال نے دیکھا۔ ایک کالا کوڑیالا سانپ ایک بہت بڑے آہنی صندوق پر کنڈلی مارے پھن اٹھائے بیٹھا ہے۔

ناگ نے کہا۔" خزانے کو ہات لگایا تو مارا جائیگا۔ بہتری اسی میں ہے کہ لوٹ جا۔"

کھوٹے لال بولا۔" مجھے خزانہ نہیں چاہیئے۔ میں دُنیا تیاگ چکا۔ میں ناگ دیوتا کا پجاری ہوں۔ باقی ساری زندگی تیری سیوا میں گذار دونگا!"

" تو جھوٹ بولتا ہے"۔ ناگ نے کھوٹے لال کو شبے کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

" آزما کر دیکھ لو"۔ کھوٹے لال نے اس سے کہا اور ناگ کے سامنے دودھ کا پیالہ رکھ دیا۔

ناگ کہ کئی برسوں کا بھوکا تھا۔ پیالے سے دودھ پینے لگا۔ دودھ پی کر چاروں طرف کھوٹے لال کے گرد گھوما۔ اس نے کھوٹے لال کے جسم کا ایک ایک حصہ دیکھ لیا۔

کھوٹے لال کے پاس چاقو تھا نہ چھری، نہ بندوق نہ رائفل، نہ پستول۔ وہ تنہا آیا تھا اور صرف ایک لنگوٹ باندھ کر تہ خانے میں داخل ہوا تھا۔

جب ناگ کو اچھی طرح دیکھنے بھالنے کے بعد اطمینان ہو گیا تو اس نے کھوٹے لال کے جسم کو اچھی طرح سے اپنی کنڈلی میں کس لیا۔ اور اسے مکمل بے بس کر کے سو گیا۔ برسوں سے سویا نہیں تھا۔ اس لئے کئی دن سوتا رہا۔ چار دن کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا کھوٹے لال اسی طرح کنڈلی میں بیٹھا ہوا آنکھیں بند کئے منہ میں بدبدا رہا ہے۔

"جے ناگ دیوتا کی۔ جے ناگ دیوتا کی!"

ناگ کھوٹے لال کی عقیدت دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے صندوق کھول کر ایک چھوٹا سا ہیرا نکالا۔ اور اُسے کھوٹے لال کی طرف پھینکتے ہوئے بولا "جا لے جا۔ ہم تجھ سے بہت خوش ہیں!"

کھوٹے لال نے انکار میں سر ہلایا۔ "مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ ناگ دیوتا بس اپنے چرنوں میں جگہ دے دو۔ میں زندگی بھر تمہاری خدمت کرونگا یہی ایک آس لے کر آیا ہوں۔"

"تو جھوٹ بولتا ہے" ناگ اسے شبے کی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "تو فلم بنانا چاہتا ہے۔"

"فلم؟ فلم کیا ہوتی ہے مہاراج"۔ کھوٹے لال بڑی معصومیت سے بولا۔

ناگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے کھوٹے لال کی راست بازی پر کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا۔ مگر پورا نہیں۔ اس لئے کھوٹے لال سے کہا۔

"جا۔ میرے لئے جنگل سے دودھ لے کر آ۔"

کھوٹے لال جنگل میں گیا اور ایک جنگلی بکری کو پکڑ کر اس کا دودھ دوھ کر لایا۔

ناگ نے دودھ کا پیالہ پی لیا۔ اور پھر کھوٹے لال کو اپنی کنڈلی میں کس کر سو گیا۔

اسی طرح پانچ سال گذر گئے۔ ہر روز کھوٹے لال جنگل میں جاتا اور دودھ کا پیالہ بھر کے لاتا اور ناگ کی خدمت میں پیش کرتا۔ اور اس کی کنڈلی میں کسا ہوا دبک کر

چپکے سے پڑ رہتا۔ ناگ نے اس کی آزمائش کرنے کے لئے اسے کئی بار ہیرے اور جواہرات موتی دینے چاہے مگر ہر بار سر ہلا کر کھوٹے لال انکار کرتا رہا۔ اور ناگ کا اعتقاد اس پر دن بدن بڑھتا گیا۔ اسی طرح پانچ سال گزر گئے۔

پانچ سالوں کے بعد ایک دن کھوٹے لال جو جنگل میں دودھ لینے گیا تو دیر تک واپس نہیں آیا۔ ناگ بہت بھوکا تھا کیونکہ اب اسے ہر روز دودھ پینے کی عادت ہو گئی تھی۔ مگر کھوٹے لال دن بھر نہیں آیا اور دن بھر ناگ بھوکا پیاسا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ شام کو جب دن ڈھل رہا تھا کھوٹے لال خالی پیالہ ہات میں لئے تہ خانے میں داخل ہوا۔ اس کے داخل ہوتے ہی ناگ نے ایک زہریلی پھنکار بھری اور پوچھا۔

"نالائق! کہاں تھا اس وقت تک؟ اور پیالہ کیوں خالی ہے؟"

کھوٹے لال نے دست بستہ عرض کی۔ "وہ پیالہ دوسرے ناگ نے پی لیا۔"

"دوسرا ناگ؟ کون دوسرا ناگ؟"

"مہاراج" کھوٹے لال کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں جنگل سے دودھ لے کر سیدھا آپ کی طرف لوٹ رہا تھا کہ راستے میں ایک کانٹے دار جھاڑیوں سے بھرے ٹیلے کے اندر سے ایک بہت بڑا خوفناک ناگ نکلا۔ اس کی پانچ آنکھیں تھیں اور پانچ زبانیں تھیں۔ اور اس کے منہ میں ایک کے بجائے تین لعل تھے۔ آپ کی ناگ منی سے بھی زیادہ روشن اور خوبصورت اور ایک کے بجائے تین!"

"ہو نہیں سکتا۔ تین لعل والا ناگ ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"میں آپ کو دکھا سکتا ہوں مہاراج۔ وہ بڑا خطرناک ناگ تھا۔ مگر بندہ بھی آپ کا شاگرد ہے میں نے دل ہی دل میں آپ کو یاد کیا اور اس ناگ سے لڑنے لگا۔ اس لڑائی میں دودھ کا پیالہ میرے ہات سے چھوٹ گیا اور زمین پر بہہ گیا۔ ناگ زخمی تو ہوا مگر مرا نہیں۔ وہ ٹیلے کے نیچے بل میں گھس گیا۔ میں بل کے اندر تو جا نہیں سکتا تھا۔

ناچار لوٹ آیا۔"

"کیا وہ ناگ ابھی تک اسی بل میں ہے؟"

"ہاں مہاراج!"

"اور اس کے تین لعل؟"

"اس کے منہ میں ہیں۔"

"چلو ہم کو دکھا دو"۔ ناگ کے دل میں لالچ پیدا ہوا۔ "اگر تو سچ بولتا ہے۔ اگر ناگ زخمی ہے اور اس کے منہ میں ایک کے بجائے تین لعل ہیں تو ہم وہ تینوں لعل حاصل کرلیں گے۔ اور تم کو اپنے خزانے میں سے پانچ فی صدی حصہ دینگے۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے"۔ کھوٹے لال ہنستا ہوا بولا۔ "بس میں تو آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

خزانے کا ناگ کھوٹے لال کے ساتھ روانہ ہوا۔ کھوٹے لال پرپیچ راستوں سے گزرتا ہوا ناگ کو ایک اونچے ٹیلے کے قریب لے گیا اور ایک بل کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ "دیکھ لیجئے حضور وہ ناگ اسی بل میں گھسا بیٹھا ہے!"

ناگ نے جب بل کے اندر جھانک کے دیکھا تو اسے بل کی تاریکی میں تین لعل روشن اور دور سے چمکتے ہوئے نظر آئے۔ ناگ زہریلی پھنکاریں بھرتا ہوا فوراً بل کے اندر گھس گیا۔ دور تک اندر جانے کے بعد جونہی اس نے لعل کو پکڑنے کے لئے منہ اٹھایا۔ وہ درد سے بلبلا کر تڑپنے لگا!

یہ لعل نہیں تھے۔ آگ کے دہکتے ہوئے انگارے تھے۔ کھوٹے لال نے موقع پا کر ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے تحت اس نقلی بل کو اندر سے دہکتے ہوئے انگاروں سے بھر دیا تھا۔ جونہی ناگ نے انگاروں کو منہ میں اٹھانا چاہا۔ اس کی زبان جلنے لگی اور وہ درد کی شدت سے تڑپنے لگا۔

"ارے یہ لعل نہیں ہیں، انگارے ہیں" ناگ نے تڑپتے ہوئے کہا۔

"انگارے ہیں؟" کھوٹے لال نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں مجھے بچاؤ، میرے منہ سے انگارے نکال لو۔ میں جل رہا ہوں!"

"کیسے نکالوں مہاراج! آپ کے منہ میں تو زہر کے دانت ہیں۔ ہاں اگر آپ منہ اچھی طرح سے کھولیں تو شاید میں کچھ آپ کی مدد کر سکوں۔"

ناگ نے اپنا منہ اچھی طرح سے کھول دیا۔ فوراً اسی وقت کھوٹے لال نے سیھ (خار پشت) کے چار بڑے بڑے کانٹوں سے ناگ کا منہ اس طرح کھول دیا کہ اب وہ کسی طرح اس منہ کو بند نہیں کر سکتا تھا۔

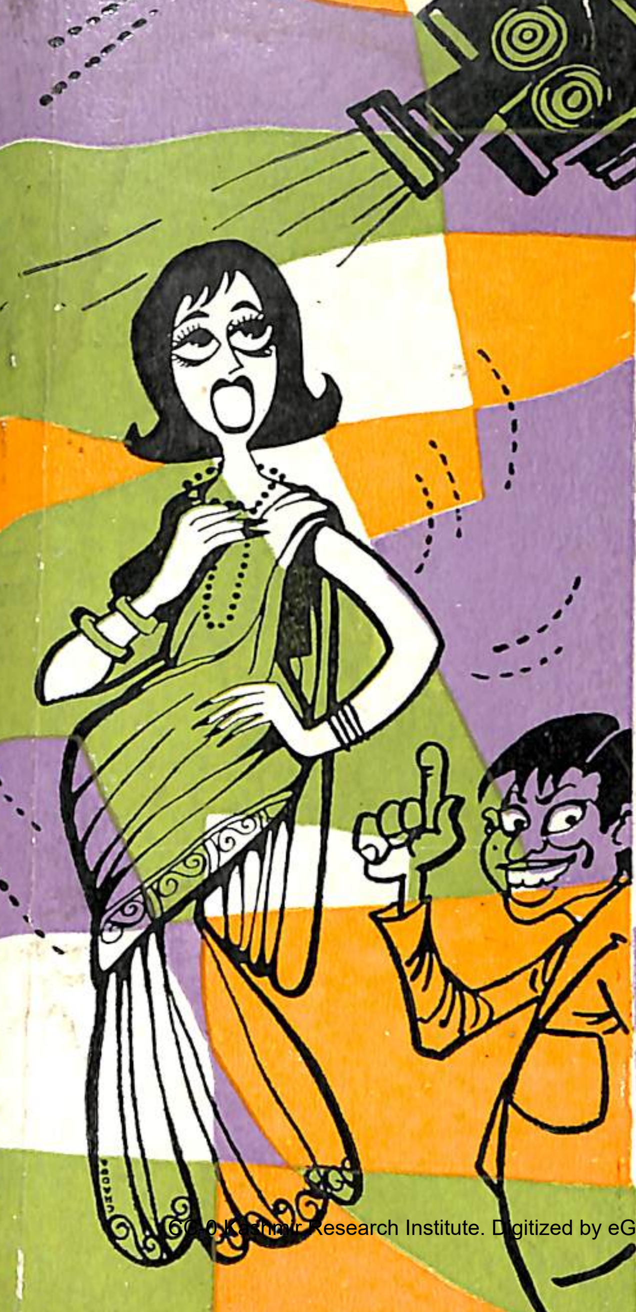
اس کے بعد اس نے سانپ کے منہ میں ہاتھ ڈال کر سب سے پہلے ناگ منی اپنے قبضے کی۔ پھر جب وہ بل کے سوراخ کو مٹی اور پتھروں سے اچھی طرح بند کرنے لگا تو ناگ نے چلا کر کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"اب تمہارا خزانہ لینے جا رہا ہوں"۔ کھوٹے لال نے ہنس کر کہا۔

ناگ کو اب کھوٹے لال کی چالاکی سمجھ میں آئی۔ مگر اب کچھ ہو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا منہ سیھ کے کانٹوں سے چھدا ہوا کھلے کا کھلا تھا۔ اب وہ کسی طرح سے اپنے منہ کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ نہ اپنے زہریلے دانت استعمال کر سکتا تھا۔ نہ فی الحال بل سے باہر نکل سکتا تھا۔

"تم کون ہو؟" ناگ نے کھوٹے لال سے پوچھا۔ "میں بس اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ جس آدمی نے ایک سانپ کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کی ناگ منی نکال لی ہے۔ وہ آدمی کون ہے؟"

کھوٹے لال نے بل کے سوراخ پر آخری پتھر رکھتے ہوئے کہا۔ "مہاراج میں ایک فلم پروڈیوسر ہوں!"



ہند
پاکٹ
بکس